ISSN:- 2394-5567

صوفیاء کی زمین کاکوری سے فارسی ادب کا ترجمان.....

سہ ماہی ادبی جریدہ۔

دبیر

جلد۔۲ شمارہ۔۴

اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۵ء

☆ایڈیٹر☆

احمد نوید یاسر ازلان حیدر

Mob. no. 09410478973

☆مراسلت کا پتہ☆

دبیر حسن میموریل لائبریری

۱۲۔ چودھری محلّہ (جنوبی)، کاکوری، لکھنؤ۔۲۲۶۱۰۱

dabeerpersian@rediffmail.com

☆ مقالہ نگاروں سے گزارش:۔ حواشی مقالہ کے آخر میں لکھیں، مآخذ کے حوالہ جات اس ترتیب میں ہوں:۔ مصنف یا مولف، کتاب کا نام جلد، مقام اشاعت، سن اشاعت، صفحہ نمبر۔

اپنے مقالے اردو ان پیج، یا ایم ایس ورڈ کی فائل میں ہمارے برقی پتے پر ارسال کریں۔

☆سرپرست☆ **پروفیسر عمر کمال الدین کاکوروی**، صدر شعبۂ فارسی، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ

☆نگران اعلی☆، **ڈاکٹر سید محمد اصغر عابدی**، شعبۂ فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

☆نگراں☆، **ڈاکٹر انجمن صدیقی** (لکھنؤ)

☆مجلس ادارت☆

پروفیسر سید حسن عباس، شعبۂ فارسی، بی ایچ یو، وارانسی

پروفیسر سید محمد اسد علی خورشید، شعبۂ فارسی، اے ایم یو علی گڑھ

پروفیسر علیم اشرف خان، شعبۂ فارسی، ڈی یو، دہلی

ڈاکٹر شاہد نوخیز اعظمی، شعبۂ فارسی، مانو، حیدرآباد

ڈاکٹر محمد عقیل، شعبہ فارسی، بی ایچ یو، وارانسی

محمد قمر عالم، شعبۂ فارسی، اے ایم یو، علی گڑھ

ذوالنورین حیدر علوی، مدیر شش ماہی ''تصفیہ'' کاکوری، لکھنؤ

سید نقی عباس کیفی، مدیر سہ ماہی ''نقد و تحقیق'' دہلی

ارمان احمد، مدیر سہ ماہی ''عرفان'' چھپرا، بہار

☆معاون مدیران☆

محمد توصیف خان کاکر۔ فارسی، اے ایم یو، علی گڑھ

عاطفہ جمال، فارسی، لکھنؤ

مناظر حق بدایونی، فارسی، اے ایم یو، علی گڑھ

محمد حسن، تعلیم، اے ایم یو، علی گڑھ

محمد انس، تاریخ، اے ایم یو، علی گڑھ

سارم عباس، فلسفہ، اے ایم یو، علی گڑھ

اشرف علی، ہندی، اے ایم یو، علی گڑھ

راجیش سرکار، سنسکرت، بی ایچ یو، وارانسی

محمد جعفر، فارسی، جے این یو، دہلی

سعد الدین، فارسی، اے ایم یو، علی گڑھ

☆ریویو کمیٹی☆

پروفیسر آذرمی دخت صفوی،
ڈائرکٹر، مرکز تحقیقات فارسی، علی گڑھ

پروفیسر شریف حسین قاسمی،
سابق ڈین فیکلٹی آف آرٹس دہلی یونیورسٹی، دہلی

پروفیسر محمد اقبال شاہد، ڈین فیکلٹی آف لینگویجز اسلامک واورینٹل لرننگ، جی سی یو، لاہور، پاکستان

پروفیسر ابوموسیٰ محمد عارف باللہ،
ڈائریکٹر البیرونی فاؤنڈیشن، ڈھاکہ، بنگلہ دیش

پروفیسر عبدالقادر جعفری، صدر شعبۂ عربی و فارسی، الہ آباد یونیورسٹی

ڈاکٹر نجم الرشید، شعبۂ فارسی، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، پاکستان

☆مجلس مشاورت☆

پروفیسر شمیم اختر، صدر شعبۂ فارسی، بنارس ہندو یونیورسٹی، بنارس

پروفیسر مسعود انور علوی، شعبۂ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

پروفیسر عراق رضا زیدی، صدر شعبۂ فارسی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

پروفیسر طاہرہ وحید عباسی، شعبۂ فارسی، برکت اللہ یونیورسٹی، بھوپال

پروفیسر محمد مظہر آصف، شعبۂ فارسی، گوہاٹی یونیورسٹی، آسام

پروفیسر عزیز بانو، صدر شعبۂ فارسی، مانو، حیدرآباد

پروفیسر وجیہ الدین، شعبہ عربی و فارسی، بڑودا یونیورسٹی، بڑودا، گجرات

احمد علی، کیپر (مینسکرٹ)، سالار جنگ میوزیم، حیدرآباد، تلنگانہ

ڈاکٹر مظہر عالم صدیقی، یوسف اسلام کالج، جوگیشوری، ممبئی

ڈاکٹر محمد شعائر اللہ خاں وجیہی قادری رامپوری، مسٹن گنج، رامپور

ڈاکٹر عابد حسین، صدر شعبۂ فارسی، پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ

ڈاکٹر اخلاق احمد، شعبۂ فارسی، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، دہلی

ڈاکٹر سیدہ عصمت جہان، مانو، حیدرآباد

ڈاکٹر رضوان اللہ آروی، شعبۂ فارسی، ایچ ڈی جین کالج، آرہ، بھوج پور

سید عادل احمد، محکمہ آثار قدیمہ، حیدرآباد، تلنگانہ

فہرست مندرجات

	عنوان	مقالہ نگار	صفحہ
۱۔	اداریہ	ازلان حیدر	۶
☆	**مقالات**		
۲۔	سرورالصدور ونورالبدور	علیم اشرف خان	۵
۳۔	عرفی شیرازی	سید محمد اصغر عابدی	۱۳
۴۔	غبار خاطر: مشعل راہ زیست	سکینہ امتیاز خان	۱۹
۵۔	ہم دلی ہم زبانی سے بہتر ہے	نکہت فاطمہ	۲۶
۶۔	قنقنوس کا تجزیاتی مطالعہ	محمد قیصر	۳۳
۷۔	تصوف کیا ہے؟	محمد افضل	۳۷
۸۔	فروغ فرخزاد اپنے معاصرین میں یکتا شاعرہ	تحسین بانو	۴۲
۹۔	مہاراجہ رتن سنگھ زخمی	ناظر حسین	۴۷
☆	**میراث خطی**		
۱۰۔	افضل الطرایق کے ایک قلمی نسخے کا تعارف	عزیز عباس/ محمد الطاف بٹ	۵۳
۱۱۔	تشریح الحروف: ایک تعارف	محمد قمر عالم	۵۷
☆	**دکنیات**		
۱۲۔	فردوسی دکن: عصامی کی رزمیہ شاعری	عزیز بانو	۶۱
☆	**آئینۂ تحقیق**		
۱۳۔	فہرست پایان نامہ ہائے شعبہ فارسی، دانشگاہ پٹنہ، بہار	عابد حسین	۶۸
۱۴۔	شعبۂ فارسی: نمل یونیورسٹی (پاکستان) کی تحقیقی خدمات	حمیرا شہباز	۷۲
☆	**چشم بینش**		
۱۵۔	عہد بابر و ہمایوں کے نامور ادباء و شعراء: ایک تعارف	صحام محیط	۷۹

اداریہ

تصوف کا لفظ اس طریقۂ کار کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جس پر کوئی اللہ والا عمل پیرا ہو، اور یہ لفظ روحانیت، ترک دنیاداری اور اللہ سے قربت کے معنوں میں بھی مستعمل ہے۔ حالانکہ مسلم علماء کا ایک طبقہ اس سے منحرف ہے اور وہ کہتا ہے کہ یہ شریعت اور قرآن کے مطابق نہیں حالانکہ صاحب علم ونظر پر یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ تصوف روحانی پاکیزگی کی نشانی ہے اور روح کی پاکیزگی تو فقط قرآن وسنت سے ہی ممکن ہے۔ لہٰذا تصوف کا سیدھا تعلق دین اسلام اور رب واحد اور رحمت اللعالمین سے ہو جاتا ہے۔ تصوف وہ ہے جو اپنے ماننے والوں کو علم، اسلام، دنیا پرستی سے دوری، اخلاق اور ادب سکھاتا ہے اور اس کے برعکس تمام رائج برائیوں سے روک دیتا ہے۔ ہندوستان میں اسلام کی آمد کا وسیلہ کچھ بھی رہا ہو مگر اس کی تبلیغ اور تشریح کا پورا پورا سہرا تصوف کے سر ہی جاتا ہے ہمارے اکابر صوفیاء اکرام نے ہندوستان میں رائج وہ تمام رسم ورواج کو جو کہ انسانیت کے خلاف تھے اور انسانیت ان کے زیر سایہ دم توڑ رہی تھی کے خلاف اللہ کی وحدانیت اور تمام انسانوں میں یکسانیت کے ذریعہ توڑ دیا۔ صوفیاء نے بڑی بڑی خانقاہیں قائم کر کے علم وعمل کی وہ شمعیں روشن کیں جن سے آج تک اور آنے والے زمانہ تک روشنیاں بکھرتی رہیں گی۔ یہ خانقاہیں صرف علم وعمل کی آماجگاہ ہی نہ تھیں بلکہ مفلوک الحال لوگوں کا سہارا، بیگھر لوگوں کا گھر، بھلوکوں کے لئے کھانے کی جگہ اور سیکھنے والوں کے لئے سیکھنے کا ذریعہ تھیں۔ ان خانقاہوں کی ہی دین ہے کہ آج ہم میں علم بھی موجود ہے اور ہمارے پاس علمی سرمایہ بھی اس کثیر تعداد میں موجود ہے کہ اس تحقیقی وترتیبی اور تنقیدی کام ہوتے جارہے ہیں۔ فارسی میں اخلاقیات جیسا وسیع وعریض موضوع تصوف سے ہوتا ہوا خانقاہوں کے دروازے پر ہی پہنچتا ہے۔ صوفیاء کے ملفوظات، فرمودات اور اقوال سب اخلاق اور تصوف کی زندہ مثال ہیں۔ آج بھی ہندوستان میں موجود خانقاہیں اس عمل کو جاری وساری رکھنے کی حتی الامکان کوشش کر رہی ہیں وہاں علم واسلام کی تبلیغ کے ساتھ ساتھ آج کے زمانہ کے اعتبار سے موقع بہ موقع ادبی سیمینار کا انعقاد ہوتا ہے جس کے ذریعہ تصوف سے معاشرے اور ادب کو دونوں کی جوڑنے کی کوشش ہوتی ہے۔ ان تمام خانقاہوں میں منیر شریف، پھلواری شریف، خانقاہ احمدیہ، خانقاہ کاظمیہ وہ چند اہم نام ہیں جنہوں نے اپنی علمی، ادبی، فکری اور تدریسی سرگرمیوں کے ذریعہ جہاں خانقاہی نظام کی نہج کی عکاسی کی ہے وہیں دور جدید کی تمام ضروریات کو علم اور اسلام سے جوڑنے کی کوشش بھی کی ہے۔ ماہ نومبر میں خانقاہ احمدیہ قادریہ، رام پور نے تصوف پر ایک روزہ سیمینار کیا اور پیش کئے گئے مقالات کے اعتبار سے بہت کامیاب سیمینار رہا۔ ہمارے اس شمارے میں بھی تصوف پر کچھ مقالات شامل ہیں جو ہمارا علمی سرمایہ بھی ہیں اور وسیلہ نجات بھی۔ اللہ علم کی برکت اور تصوف کی روشنیوں سے تمام طالبِ علموں کے ذہن ودلوں کو منور فرمائے۔ آمین۔

﴿ازلان حیدر﴾

سرورالصدور ونورالبدور: حضرت صوفی حمیدالدین ناگوریؒ کا ملفوظ

پروفیسر علیم اشرف خان، شعبۂ فارسی، دہلی یونیورسٹی، دہلی

قرون وسطیٰ کی تاریخ، تمدن، ثقافت اور تہذیب کے مطالعے کے لئے ملفوظاتی ادب کی اہمیت مسلم ہے یہ بھی بحث ومباحثے اور گفتگو کا موضوع ہوسکتا ہے کہ ہمارے دانشور اور مورخ اس کے استعمال کے سلسلے میں مختلف الرائے ہیں مگر یہ موضوع فی الحال مقالے کی حدود سے خارج ہے اسلئے یہ بیان کرنا لازمی ہے کہ اس موضوع پر ایک نہایت معقول اور مستند کتاب ''ملفوظاتی ادب کی تاریخی اہمیت'' عنوان سے پروفیسر محمد اسلم صاحب نے رقم کی تھی جو خاصی مقبول ہے اور اسے اسناد کا درجہ بھی حاصل ہے۔ اس مقالے میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ ملفوظات پر ایک مجموعی نظر ڈالتے ہوئے صوفی حمیدالدین ناگوریؒ کے ملفوظات ''سرورالصدور ونورالبدور'' میں درآئے معاملات و واقعات کو قرون وسطیٰ کی تاریخ اور ثقافت کے مطالعے کے لئے موضوع بحث بنایا جائے۔

ملفوظاتی ادب کی روایت ایران اور سنٹرل ایشیا سے ہندوستان آئی اور یہاں پر ادب کی ایک باقاعدہ صنف بن گئی جس میں ہمیں مختلف ملفوظات میں علم وعمل، پند ونصیحت، روز وشب، اچھا و برا، اعمال واوراد، اذکار واشغال اور اسی قبیل کی بہت سی باتیں تحریری شکل میں مل جاتی ہیں ان میں بہت سے واقعات اور بیانات تاریخی، ثقافتی اور معاشرتی نوعیت کے موجود ہیں جو ہمارے قرون وسطیٰ کے مطالعے کے لئے نہایت اہم مآخذ ہیں اور ان پر ہمیں اس دور کے سماج میں ہونے والے واقعات اور معاملات کو سمجھنے میں خاصی مدد ملتی ہے۔ ایران میں ہمیں یہ روایت خواجہ عبداللہ انصاری کے ''امالی پیر ہرات'' اور ابوالسعید ابوالخیر کے ''سخنان'' میں بھی کم وبیش اسی نوعیت کی معلومات ملتی ہیں۔ جو ان بزرگوں نے اپنے مریدین، خلفا اور عوام الناس کی تربیت کے لئے مختلف مجالس میں دوران وعظ وتذکیر بیان کئے ہیں جن سے عملی تربیت مقصود تھی۔ ''حالات وسخنان شیخ ابوالسعید بن ابی الخیر المہنی'' کے ملفوظات کو ۵۴۰ ہجری مطابق ۱۱۴۵-۴۶ عیسوی میں لطف اللہ نے جمع کیا اور ''اسرار التوحید فی مقامات ابی سعید'' کو ۵۷۴ ہجری مطابق ۱۱۷۸ عیسوی میں محمد بن منور نے جمع کیا اور ۱۹۳۴ء میں احمد بہمن یار نے تہران سے تصحیح کے بعد شائع کیا۔

ملفوظات کے مفظی معنی اس طرح بیان کئے گئے ہیں:

۱ تلفظ کیا گیا (تاج اللغات۔ص ۸۷۸)

۲ کہا ہوا، بیان کیا ہوا (فرہنگ آنندراج۔جلد ششم۔ص ۱۴۲۱)

۳ پڑھا گیا، بزرگوں کے مقولے (نوراللغات۔جلد چہارم۔ص۴۵۴)

۴ بزرگوں کا کلام، حدیث بزرگان، کتاب جس میں کسی بزرگ کی کیفیت اس کی اپنی زبانی لکھی ہو (تاج اللغات۔اردو۔جلد چہارم۔ص۵۸۴)

اس طرح ملفوظات کے معنی مقالات یا تقاریر کے ہیں یہ صوفیا کے یہاں تعلیم وتربیت کا ایک رسمی طریقہ ہے، مرید اپنے شیخ کے پاس بیٹھ کر کوئی عنوان شروع کر دیتے ہیں اور شیخ اس عنوان پر گفتگو کرتے ہیں۔ کچھ مریدین جو ذہین و عقل مند ہوتے ہیں اس گفتگو کو نقل کرتے ہیں اور بعض مریدین اس تحریر کو اپنے مرشد کو دکھا لیتے ہیں جو استناد کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ انہی ارشادات کو مرتب کر کے ملفوظات کے نام سے شائع کرا دیا جاتا ہے۔ (یہاں مراد کتابت کر کے قلمی نسخہ تیار کرنے سے ہے) یہ سلسلہ حضرت عثمان ہرونیؒ کے ملفوظات ''انیس الارواح'' جسے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے ،ان کے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے ملفوظات ''دلیل العارفین'' کو خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ نے، اور خواجہ بختیار کاکیؒ کے ملفوظات ''فوائد السالکین'' کو حضرت فرید الدین گنج شکرؒ نے، اور حضرت بابا فریدؒ کے ملفوظات اسرار الاولیاء'' کو خواجہ بدرالدین اسحٰقؒ نے اور ''راحت القلوب کو حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے، اور حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے ملفوظات ''فوائد الفواد'' کو امیر حسن سجزی نے سلسلہ در سلسلہ مرتب کیا۔

ہندوستان میں ملفوظاتی ادب کی گران مایہ خدمت کا سہرا حضرت امیر حسن سجزی دہلوی کے سر ہے جنہوں نے حضرت نظام الدین اولیا کے ملفوظات کو فوائد الفواد کے نام سے جمع کر کے ہندوستانی ملفوظاتی ادب کی تاریخ میں سنگ میل کا درجہ عطا کیا۔ فوائد الفواد کی تکمیل کے بعد سے یہ چشتی بزرگوں، مریدوں، خلفا اور عقیدت مندوں کا دستور العمل بن گیا۔ اس ملفوظ کے بعد مختلف سلاسل کے بزرگوں نے اس طرف خصوصی توجہ کی اور سلطان التارکین صوفی حمید الدین ناگوریؒ کے حقیقی پوتے شیخ فرید الدین محمود نے اپنے دادا کے ملفوظات ''سرور الصدور و نور البدور'' کے نام سے جمع کیا۔

عام طور پر مریدین نے مشائخ کبار کے اقوال وتعلیمات کا ذخیرہ فراہم کر کے ان کے اقوال واعمال وحالات کی نشاندہی کی ہے اس میں بعض اوقات سماجی اور ثقافتی اہمیت کی معلومات بھی در آتی ہیں جو اس وقت تاریخی مآخذ کے پیش نظر تحریر نہیں ہوتی ہیں مگر بعد میں یہ نہایت مستند اور اہم تاریخی مآخذ بن جاتی ہیں کچھ علاقوں اور جگہوں کے نام ہمیں جغرافیائی حدود کے تعین میں مدد دیتے ہیں۔ کچھ کتابوں کے نام اور ان کے اقتباسات ہمیں ان نایاب کتابوں سے متعارف کراتی ہیں اور شاہان وقت سے صاحب سلسلہ کے مراسم کا بھی اس میں ضمنی طور سے ذکر آجاتا ہے جو نہایت اہم اور مستند مآخذ کا کام انجام دیتے ہیں۔

ملفوظات سلطان التارکین صوفی حمید الدین ناگوری (متوفی ۲۹، ربیع الاول ۶۷۳ ہجری مطابق ۱۲۷۴ عیسوی)

خواجہ معین الدین چشتیؒ کے خلیفہ تھے اور سرور الصدور کو ان کے حقیقی پوتے اور خلیفہ شیخ فرید الدین محمودؒ نے جمع کیا ہے۔ صوفی حمید الدینؒ نے اپنے ایک مرید سے یہ شکوہ کیا تھا کہ ناگور کے عوام مجھ سے علم حدیث سنتے ہیں اور مجھے فرصت نہیں دیتے کہ تجھے میں تصوف کا درس دے سکوں ان کی عبارت یہ ہے۔ ''مرا اینجا مشغولی است کہ خلق ناگور درین وقت از من علم حدیث می شنوند و مرا فرصت نیست کہ درین میان ترا علم تصوف بیاموزم۔'' یہ حوالہ بھی ملتا ہے کہ وہ ہندی زبان میں شعر کہتے تھے ''بزبان ہندی شعر خوب می گفتند۔''

سلطان التارکین نے ساری عمر گوشت سے پرہیز کیا، گوشت پر اپنی فاتحہ دلوانے اور عرس میں گوشت پکوانے سے منع کیا کرتے تھے۔ اس تاریخی اہمیت کی اطلاع کو جو اس عہد کی تہذیب، ثقافت، تمدن اور رواداری کی مثال ہے آج کے موجودہ عہد میں اس حوالے سے ہمیں یہ سمجھنا چاہئے کہ وہ جس علاقے میں سکونت پذیر تھے وہاں ہندوؤں کی کثیر آبادی رہتی تھی جو گوشت سے پرہیز کرتے تھے ان کے مذہبی جذبات کو ٹھیس نہ پہنچے اسلئے انہوں نے گوشت کو ترک کر دیا اور ساری زندگی گوشت تناول نہ فرمایا۔

صوفی حمید الدین کے مطابق نماز میں حضوریٔ قلب کے مقامات اس طرح ہیں: ''نماز میں تکبیر مقام ہیبت ہے، قیام مقام ارب، قرأت مقام مکالمت، رکوع مقام خوف، سجود مقام مشاہدہ اور قعود مقام الفت ہے''۔ وہ اپنے مریدوں کو کتابوں کے مطالعے کی تاکید کرتے تھے ان کتابوں میں کیمیائے سعادت، تفسیر کشاف، کتاب فائق، مقامات شیخ ابو سعید ابیا لخیر، قوت القلوب اور تفسیر زاہد خاص ہیں۔ سماع ایک ایسا موضوع ہے جس پر چشتی بزرگوں نے نہایت استقامت دکھائی ہے اور اس کی دلیل میں صوفی حمید الدین ناگوریؒ کا عقیدہ اور رائے جو انہوں نے سماع سے متعلق بیان کی ہے وہ نہایت دلچسپ ہے۔ وہ فرماتے ہیں: ''منکر سماع وہ ہے جو صاحب دل نہیں اور سماع اسے حلال ہے جو سماع کے وقت اپنی جان جانِ آفرین کے سپرد کرنے کیلئے آمادہ ہو۔ مردہ کب سماع کرتا ہے؟ اور زندہ کب سماع نہیں کرتا؟۔''

مزید ترک طلب کی تشریح میں نہایت منطقی، استدلالی اور فکر انگیز خیال کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے: ''اہل شبہ کے مانند حق کا طلب نہ ہو اور معطلوں کی مانند ترک طلب نہ کرے خدا تعالیٰ کسی ایک جہت میں نہیں کہ تو اسے ڈھونڈے، کسی مکان میں نہیں کہ تو اس کی جستجو کرے، وہ آنے والا نہیں کہ اسے بلائیں، وہ دور نہیں کہ کوئی اس سے نزدیک ہو، وہ گم شدہ نہیں کہ کوئی اسے تلاش کرے، وہ زمانی نہیں کہ کوئی زمانے کا منتظر ہو یہ سب طلب کی نفی ہے۔ بس اثبات یہ ہے کہ تو اپنی اور اپنے اوصاف کی نفی کرے۔ طلب یہ نہیں کہ کوئی اس کی طرف دوڑے۔ بلکہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو اس میں فنا کر دے۔ طلب یہ نہیں کہ تو اسے ڈھونڈے بلکہ یہ ہے کہ خود اس میں گم ہو جائے۔''

آپ کی ایک تالیف ''اصول الطریقت'' ہے جس میں بندگان خدا کی تین اقسام بیان ہوئی ہیں (۱) مغرور (۲)

مشکور (۳) فانی (اس کی شرح بھی بیان کی گئی ہے انہوں نے راہ کے مراتب کا ذکر کرتے ہوئے اس کے ۸ درجے متعین کئے ہیں: (۱) علم (۲) عمل (۳) نیت (۴) صدق (۵) عشق (۶) توبہ (۷) سلوک (۸) حضوری (ان آٹھ درجوں کی مخصوص پیرائے میں تفصیل بھی بیان کی گئی ہے)

سرور الصدور پر مختلف محققین اور دانشوروں نے تبصرہ کیا ہے اور اسے عہد وسطیٰ کی معاصر تاریخ کا مستند باب قرار دیا ہے اس کا ایک قلمی نسخہ جو ریاست راجستھان کے جھنجھنوں میں تھا اور اب مولانا آزاد لائبریری کے سبحان اللہ کلکشن میں محفوظ ہے اس کے مقدمے کو اپنے عہد کے ممتاز عالم دین مولانا انوار الحق دہلوی قادری نے نہایت مدلل اور عالمانہ تجزیے سے مزین کیا ہے اس مقدمے کے مطالعے سے سرور الصدور کی اہمیت اور اسمیں درآئے بہت سے اشتباہات پر بھی نظر پڑتی ہے۔

سرور الصدور کے مقدمے میں محمد انوار الحق قادری دہلوی نے نہایت وضاحت سے یہ بات تحریر کی ہے کہ وہ ۶ سال مستقل اس جد و جہد میں تھے کہ مجموعہ ملفوظات حضرت سلطان التارکین شیخ حمید الدین محمد الصوفی الناگوری مجھے دستیاب ہو جائے کہ ذی القعدہ مہینے کے آخر میں ۱۳۰۱ھ میں ان کے عزیز دوست حاجی محمد علی خان نے یہ موقع فراہم کیا اور انہیں کتاب سرور الصدور حاصل ہوئی جو شاہ نور محمد سلمہ اللہ خلف الصدق وسجادہ نشین حضرت شاہ نجم الدین صوفی الچشتی السلیمانیؒ متوطن قصبہ جھنجھنوں علاقہ شیخاوٹی از اقطاع راجستھان سے ملی ہے۔ مزید برآن جناب شاہ نجم الدین صوفی کو حضرت سلطان التارکین سے ایک نسبت فرزندی بھی حاصل تھی۔ اس مجموعہ میں مسائل طریقت کا بیان آیا ہے میں نے اس کتاب میں دیکھا ہے کہ بعض باتیں بادی النظر میں سمجھ سے خارج ہیں ان پر جو اختلافات واشتباہات ہوئے ہیں ان کی اصلاح ہو۔ فاضل محقق نے اپنے مقدمے کو تین مباحث میں اس طرح منقسم کیا ہے:

(۱) مبحث اول:۔ اس میں کتاب کے نسخے اور مولف سے متعلق باب ہے نسخے کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کل ۳۵۹ اوراق پر مشتمل ۱۴۵ اجزا ہیں جس میں چند رسائل تصوف مثل ''اصول الطریقت، مکتوبات وعبارات اور متفرق ملفوظات، غزلیات ورباعیاتِ سلطان التارکین بھی موجود ہیں۔ اس میں مکتوبات شیخ فرید الدین محمود اور شیخ نجیب الدین ابراہیم جو فرزندان شیخ عزیز الدین سعید بن حضرت سلطان التارکین بھی درج ہیں نیز اس میں قصائد، مدحیہ، مراثی اور سلسلہ چشتیہ کے شجرے، سلطان محمد عادل بن سلطان غیاث الدین، سلطان دہلی کے چند احکام وفرامین بھی موجود ہیں۔ اس میں سلطان غیاث الدین تغلق کے اکابر وعمائدین دولت اور حضرت سلطان التارکین کے روضے کی تعمیر کے احوال بھی مندرج ہیں۔ میں نے اس کام کو مکمل کر کے اس دستاویز سے اپنا اخلاص وارادت ظاہر کر دیا ہے۔

کتاب کے آخری حصے میں سرور الصدور ہے اس مجموعے میں تمام رسائل، مکتوبات وملفوظات حضرت سلطان التارکین خواہ نثر میں ہوں یا نظم میں پوری کتاب کا تیسرا حصہ ہے اور باقی ۲/۳ حصے میں مکتوبات شیخ فرید الدین محمود اور ان

کے بھائی پر محیط ہیں۔ حالانکہ مولف نے پوری کتاب میں ''سرور الصدور'' نام کا استعمال نہیں کیا ہے مگر داخلی شہادت سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ سرور الصدور کو شیخ فرید الدین محمود کے ایک لڑکے نے تالیف کیا ہے، حوالہ:

''بعد ازین فوایدی کہ از لفظ مبارک شیخی و والدی قدوۃ الاصفیاء وارث الانبیا والمرسلین فرید الحق والدین محمود بن سعید بن محمد الصوفیؒ والرضوان واسکنہ علیٰ درجات الجنان شنیدہ شدہ است انتہیٰ ملخصاً و غالباً یکی ازین دو یعنی شیخ محی الدین و شیخ قطب الدین کہ فرزندان شیخ فرید الدین محمود بودند۔ مولف سرور الصدور خواہد بود، بنابراین کہ در سرور الصدور نوشتہ است کہ کلاہ مبارک بر سر این ضعیف نہادند و گفتند کہ سیدی این کلاہ خلافت است۔'' (ص ۲۶۸)

مزید انوار الحق قادری دہلوی نے لکھا ہے:

''از مکتوبات شیخ محمود ممدوح پیدا است کہ وی رحمۃ اللہ علیہ ہمین ہر دو فرزند را بہ سیدی مخاطب و مفتخر می فرمود و غیر ازین دو کسی را از فرزندان خود سیدی ننوشتہ است۔''

غوثی شطاری نے گلزار ابرار میں شیخ فرید الدین محمود کے ایک تیسرے بیٹے کا نام شیخ عزیز الدین درج کیا ہے مگر یہ بات مقدمے میں بیان نہیں ہوئی ایک اور بات صاحب مقدمہ نے یہ تحریر کی ہے کہ جب ہم شیخ فرید الدین محمود اور سلطان محمد بن تغلق کی ملاقات کا ذکر پڑھتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ عبارت بھی اسی شخص نے تحریر کی ہے جس نے مکتوبات تحریر کئے ہیں۔ اس لئے اس مجموعے کے جامع اور مولف شیخ فرید الدین محمود کا بیٹا ہے جو سب سے چھوٹا تھا۔ مگر جو باتمصدقہ ہے صرف اتنی ہے کہ ان ملفوظات کا جامع اور مولف حضرت شیخ فرید الدین محمود کا کوئی لڑکا ہے۔

سرور الصدور میں ارشادات حضرت شیخ فرید الدین محمود ۷۲۳ھ سے ۷۳۴ھ تک درج ہیں اور شیخ فرید الدین محمود کا انتقال ۷۳۴ھ میں ہی ہوا تھا اس طرح ملفوظات کا یہ مجموعہ شیخ فرید الدین محمود کے انتقال کے بعد تالیف ہوا ہے۔ مولف مقدمہ کے مطابق اس کتاب کو تخمیناً آٹھویں صدی ہجری کے وسط میں تحریر کیا گیا ہے مگر چونکہ اس میں ''مرآۃ الاسرار'' کا سال تکمیل ۱۰۶۵ھ ہے یعنی اس تالیف کے ۳۰۰ سال بعد کی کتاب کے حوالے سرور الصدور میں کس طرح داخل ہو گئے؟ کیونکہ ایسا لگتا ہے سلطان التارکین کے کسی صاحبزادے یا اولاد امجاد میں سے کسی نے ''رسالہ عشقیہ'' کو بھی اسی لفظ اور لقب یعنی ''جدی الاعلیٰ'' سے عبارت کیا ہے۔ یہ خود قلمی نسخہ کے اصل اور مستند ہونے پر ایک بڑا سوال ہے۔

دوسرا ہم شبہ انوار الحق صاحب نے یہ بھی اٹھایا ہے کہ جسے ہم ملفوظات صوفی حمید الدین ناگوری یا سلطان التارکین سمجھتے ہیں وہ دراصل شیخ فرید الدین محمود کے ملفوظات ہیں نہ کہ سلطان التارکین کے، ان کے الفاظ یہ ہیں:

''باید دانست کہ کتاب سرور الصدور علی ھو المشھود ہر چند از ملفوظات حضرت سلطان التارکین و از تالیفات نبیرۂ ایشان شیخ فرید الدین محمود شمردہ میشود، اما بعد از مطالعہ کتاب بوضوح پیوست کہ بنای تالیف تالیف آن بر جمع افادات و ارشادات حضرت شیخ فرید الدین محمود است و

جامع ومولف او یکی ازفرزندان شیخ است (مقدمہ)''۔

یہ نہایت دقیق، دقت طلب اور تحقیق کا متقاضی موضوع ہے کہ آیا انوار الحق صاحب کا یہ بیان حقائق پر مبنی ہے یا نہیں۔ انوار الحق صاحب نے یہ بھی تحریر کیا ہے کہ ان کے پاس موجود قلمی نسخے میں بے انتہا غلطیاں موجود ہیں جو انہوں نے مقابلے کے بعد انجام دیا ہے ان کے مطابق:

''باید دانست کہ نسخہ این مجموعہ آنچہ پیش فقیر رسیدہ پر غلط نسخہ ای بودہ کہ نظیرش در کثرت اغلاط کمتر دیدہ شدہ، حیران ماندم کہ بی مقابلہ بانسخہ دیگر تصحیح این کتاب نایاب از ہیچو منی کم سوادی فقید الاستعدادی خیلی دشوارست۔ ناچار مصلحت آن دیدم کہ از نسخہ موصوفہ تمامی رسائل ومکتوبات و عبارات را کہ خاصتہً از حضرت سلطان التارکین است۔ بہ تمامہا در سر آغاز این منقولہ جدید درج کردم وچیزی از ان بی استنساخ باقی نگزاشتم وتاریخ روضہ متبرکہ ایشان وفرامین پادشاہی ورقعات و عبارات مختلفہ راضمیمہ آن بہ حذف اکثری از مکررات گردانیدم وتانواستم۔ بعد استمداد ہمت وتوفیق در تصحیح الفاظی کہ خود بر اغلاطش شاہد بود وبہ صراحت غلط می نمود بدل نمودم وباقی ہمہ عبارات بر حال خود است وامید دارم کہ بعد ازین بہ فضلہ سبحانہ نسخہ صحیحہ ازین کتاب میسر آید ودر آخر کتاب سرور الصدور را در تمام وکمال آن قدر کہ در اصل بود بہ نقل در آوردم وبہ این ترتیب از نسخہ اصل کہ چہل وپنج اجزا بود این منقولہ منتخبہ جدیدہ فریب جہ ہیجدہ اجزا مرتب گردیدہ۔'' (مقدمہ)

ظاہر ہے مقدمے میں اس صراحت کے بعد سرور الصدور کی اہمیت دوچندان ہو جاتی ہے کہ اس کو ایک صاحب علم وفضل نے مقابلے کے بعد ترتیب دیا ہے۔ اس ملفوظ سے یہ بھی اطلاع ملتی ہے کہ اطراف ناگور میں غیر مسلم حضرات کی تعداد زیادہ تھی اس لئے سلطان التارکین نے اپنی وصیت میں یہ کہا تھا: ''چون بہ روح او چیزی بدھند باید کہ گوشت ندھند'' (ص ۲۲۱)۔ ہمارے چشتی صوفیا کا یہ بڑا کارنامہ ہے کہ انہوں نے ہندوستان کی سلیمت، یکجہتی اور رواداری کو ہمیشہ ملحوظ خاطر رکھا۔ صاحب مقدمہ نے حضرت سلطان التارکین کی اولادوں اور نبیرگان کے سال ولادت ووفات کا نہایت مدلل طریقے سے ذکر کیا ہے مزید سرور لصدور کے صفحات ۱۴۰، ۱۵۷، ۱۶۰ اور ۱۶۱ پر بھی عرس میں گوشت پکائے جانے سے منع کیا گیا ہے حوالہ یوں آیا ہے: بقول حضرت فرید الدین محمود:

''بجا آوردن خدمت عرس جد بزرگ خود حضرت سلطان التارکین اہتمامی زائد الوصف می داشت تا آنکہ از اوایل ماہ ربیع الاول از برای فراہم آوردن اجناس پخت طعام عرس و جز آن تاکیدی کردہ حالانکہ عرس شریفش در آخر ماہ ربیع الآخر مقرر است کما سبق وحسب وصیت شیخ

بزرگ از پختن گوشت در عرس شریف او منع می فرمود۔''

امیر خسرو کی غزلیں بھی شیخ فریدالدین محمود ناگوری کی مجلس سماع میں یاران طریقت کے لئے مایۂ نشاط تھیں ایسی ہی ایک غزل مقدمے میں درج ہوئی ہے جس کا مطلع ہے:۔نسیم عشق چون نالہ زکوی وخانہ می خیزد۔زہر کنجی بہ بوی وصل صد دیوانہ می خیزد (ص ۱۵۵)۔صاحب مقدمہ نے کئی تاریخی اشتباہات کی طرف بھی مقدمے میں مدلل اشارے کئے ہیں اسی ضمن میں سلطان محمد عادل کی تخت نشینی کے سال پر یہ تبصرہ نہایت اہم ہے:۔

''تاریخ تحریر این فرمان پادشاہی کہ ذی الحجہ ۷۲۴ھ مندرج است باعنوان او کہ در آن نام سلطان محمد عادل بردہ است درست نمی نشیند، زیرا کہ محمد عادل در شہور ۷۲۵ بماہ ربیع الاول بجای پدر بر تخت سلطنت جلوس فرمودہ لاجرم این فرمان اگر مرقوم ذی الحجہ ۷۲۴ھ است از پدرش سلطان غازی غیاث الدین تغلق خواہد بود اگر فرمان او سلطان محمد عادل بن تغلق است ناگزیر تاریخ تحریر او ذی الحجہ ۷۲۵ سالی متاخر از وخواہد بود۔''

(۲) مبحث دوم:۔اس میں مولف مقدمہ نے فواید متفرقہ کے ضمن میں ایک فہرست درج کی ہے جس میں انہوں نے تحریر کیا ہے:''از بعض فواید متفرقہ وادعیہ شریفہ کہ درین مجموعہ یافتہ ام فہرستش درین جا ثبت ومرقوم کردہ می شود۔اول مبعات عشر است (ص ۱۵۰)، دوم افوض امری الی اللہ (ص ۱۵۴)، سوم دعای آخر الزمان وغیر آن (ص ۱۶۷)، چہارم نماز ہلاہل (ص ۱۸۰)، پنجم عمل دفع جزام (ص ۱۸۰)، ششم عمل شفا وتعویذ و برآمدن حاجات ودعا (ص ۱۸۱)، ہفتم تعویذ دفع نار ولقوہ وقولنج (ص ۱۸۲)، ہشتم دعای سفر (ص ۱۸۳)، نہم اقوال متفرق ورسائل طریقت وشریعت (ص ۱۸۶)، دہم مناجات مولانا شمس الدین مودود سمرقندیؒ (ص ۱۹۰)۔

مولف مقدمہ کے مطابق انہوں نے خاتمے میں یہ درج کیا ہے انہوں نے خود چند اجزا کتابت کئے ہیں اور باقی ان کے احباب واعزہ نے کتابت کئے ہیں اور بطور یادگار انہوں نے ہر کاتب کے نام کے ساتھ اس کے ذریعے کتابت شدہ صفحات کے نمبر بھی اسی ترتیب میں درج کر دئے ہیں۔کتاب کے آغاز میں دو صفحات خود مولف مقدمہ انوار الحق قادری دہلوی نے کتابت کئے ہیں صفحہ ۳ سے ۱۶ تک ان کے دوست حافظ سید حسین خان بسمل وکی ریاست ٹونک نے، صفحہ نمبر ۳۴ سے ۴۷ تک اور صفحہ نمبر ۱۹۷ سے ۲۱۰ تک ملک شاہ محمد خان وکیل ریاست دھولپور اور صفحہ ۸۹ سے ۱۰۴ تک احمد علی خان وکیل ریاست جھالاراڑ اور صفحہ نمبر ۱۷ سے ۳۰ تک مولف مقدمہ کے صاحبزادے محمد رکن الدین اور صفحہ نمبر ۵۴ تا ۵۹ محمد سلام الحق اور صفحہ نمبر ۶۰ ان کے دوسرے صاحبزادے نے کتابت کئے ہیں۔تتمہ میں یعنی صفحہ نمبر ۳۳، ۴۸ تا ۵۲، ۶۲ تا ۸۹، ۱۲۵ تا ۱۹۱ خود مولف مقدمہ انوار الحق نے کتابت کئے ہیں جو ۳۰ محرم الحرام ۱۳۰۲ھ میں بدھ کے روز ان کے قیام کوہ آبو

(راجستھان) میں کتاب کے انتخاب اور مقدمے کے بعد مکمل ہوا تھا ان کے مطابق:

انا العبد الفقیر الراجی عبد الله المدعوبه محمد انوار الحق الدهلوی القادری تاب الله علیه و غفرله ولوالدیه و الحمد لله تعالیٰ علی الاتمام و الصلوة والسلام علی رسوله سیدنا محمد و آله و اصحابه۔"

سرور الصدور میں تیرہویں صدی عیسوی کی بعض اہم شخصیات کے بارے میں بھی نہایت اہم اطلاعات درج ہیں جو سلطان التارکین کے معاصر ہیں جن میں قاضی منہاج سراج، حسام الدین درویش، نجیب الدین بخشی اور فخر فاقلہ مشہور ہیں۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ عہد وسطیٰ میں مسلمانوں کی تعلیمی کاوشوں، علمی فضا اور معیار تعلیم کے باب میں اس میں خاصی اہم اطلاعات ہیں اور بقول خلیق احمد نظامی: ''سرور الصدور اس عہد کے مذہبی خیالات اور رجحانات کا پر اعتماد مرقع ہے۔'' (سم آسپیکٹس آف ریلیجین اینڈ پالیٹیکس ان انڈیا ڈیورنگ دی تھرٹین سینچری۔ ص ۲۷۰)

سرور الصدور میں فارسی کے ساتھ ساتھ جا بجا ہندوی الفاظ کا بے دریغ استعمال ہوا ہے مثلاً کھاٹ، تھال، کھچڑی اور چوڑہ وغیرہ۔ انوار الحق صاحب کا مفصل مقدمہ ۳۲ صفحات پر مشتمل ہے جو نہایت عالمانہ اور بصیرت افروز تبصرہ ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی ناقدانہ تصحیح کا مظہر ہے اگر ان ۳۲ صفحات پر توجہ اور دقت نظر سے تحقیق کا کام انجام دیا جائے تو سرور الصدور و نور البدور کی سائنٹفک تصحیح کا کام مکمل ہو سکتا ہے۔

﴿فہرست منابع و مآخذ﴾

(۱)۔ ملفوظاتی ادب کی تاریخی اہمیت۔ پروفیسر محمد اسلم۔ ادارۂ تحقیقات پاکستان۔ دانشگاہ پنجاب۔ لاہور۔ ۱۹۹۵ء، (۲)۔ سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی۔ دہلی۔ ۱۹۵۸ء، (۳)۔ سرور الصدور۔ مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ فارسی تصوف ۱۶۱/۲۱، (۴)۔ بزم صوفیہ۔ سید صباح الدین عبد الرحمن۔ اعظم گڑھ۔ ۱۹۵۰ء، (۵)۔ اخبار الاخیار فی اسرار الابرار۔ شیخ عبد الحق محدث دہلوی۔ تصحیح ڈاکٹر علیم اشرف خان۔ انجمن مفاخر فرہنگی۔ تہران۔ ایران۔ ۲۰۰۵ء، (۶)۔ تذکرہ علمائے ہند۔ رحمن علی۔ لکھنؤ۔ ۱۹۱۴ء، (۷)۔ سیر الاولیاء۔ سید امیر خورد کرمانی۔ دہلی۔ ۱۹۸۱ء، (۸)۔ آئینۂ ملفوظات۔ علامہ اخلاق حسین دہلوی۔ دہلی۔ ۱۹۸۳ء، (۹)۔ فرائد الفواد۔ مطبوعہ لاہور۔ ۱۹۶۶ء، (۱۰)۔ The Life & Times of Khawaja Qutubuddin Bakhtiyar Kaki. K A Nizami. Delhi. 1973، (۱۱)۔ The Life & Times of Sheikh Fariduddin Ganj e Shakr. K A Nizami. Aligarh. 1955 (۱۲)۔ Some aspects religion and politicsin India during the therteen century. K A Nizami, Aligarh. 1961

عرفی شیرازی

ڈاکٹر سید محمد اصغر عابدی، شعبۂ فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

عرفی شیرازی کی زندگی، شاعری، خیالات اور اس کے کردار کے بارے میں کچھ مہمل قصے مشہور ہو گئے ہیں۔ اس کے معاصرین اور اس کے بعد کے قریب ترین زمانہ کے تذکرہ نگاروں میں بہت اختلاف ہے۔ مطابق شعرالعجم عرفی کا اصل نام محمد، لقب جمال الدین ہے۔ تقی اوحدی جو کہ عرفی کے معاصرین مین ہے اس کا نام جمال الدین سیدی لکھتا ہے، ایک دوسرے معاصر عبدالباقی اپنی کتاب مآثر رحیمی اور دیباچہ کلیات عرفی دونوں جگہ اس کا نام خواجہ سیدی محمد لکھا ہے ایک اور معاصر ناصر عبدالنبی فخرالزمانی نے عرفی کا نام محمد حسین لکھا ہے اور کہتے ہیں صغرسنی میں عرفی کو مولانا سیدی کہا جاتا تھا۔ محمد علی داعی الاسلام اپنی کتاب ''شعروشاعری عرفی'' میں اصل نام خواجہ سیدی محمد لکھا ہے اور جمال الدین لقب بتایا ہے اصل عبارت یہ ہے، ''اسمش خواجہ سیدی محمد ولقبش جمال الدین است۔'' محمد علی کے اس بیان سے عبدالباقی کی بات صحیح ثابت ہوتی ہے اس طرح عرفی کا نام مع لقب سیدی محمد جمال الدین ہوا۔ عرفی نے اپنا تخلص اپنے والد زین الدین علی یلوی کے ایک معزز عہدہ جسکو عرف کہتے ہیں اس کی مناسبت سے رکھا۔ مآثر رحیمی میں ہے کہ، ''چون پدرش بعض اوقات در دیوان حکام فارسی بہ امروزارت داروغہ دار فصل شیراز مشغولی می نمود مناسبت شرعی عرفی را منظور داشتہ تخلص خود عرفی کرد۔''

عرفی کی پیدائش کے سن کا صحیح علم نہیں ہے لیکن اس کی وفات ۱۸ شوال ۹۹۹ھ میں ہوئی اس وقت عرفی کی عمر تقی اوحدی کے مطابق ۳۸ سال اور اور عبدالنبی کے مطابق ۴۰ سال تھی۔ اس لحاظ سے عرفی کا سنہ پیدائش ۹۵۹ سے ۹۶۲ھ کے درمیان ہوگا۔ عرفی کی ابتدائی تعلیم وتربیت شیراز میں ہوئی۔ شاہنواز خاں معاصر الامراء میں لکھتے ہیں کہ عرفی نے موسیقی، مصوری اور نقاشی کی تعلیم بھی پائی تھی۔ عرفی نے اپنی عمر کا زیادہ حصہ ہندوستان ہی میں گذارا۔ وہ ایران کے دوسرے مقامات پر بھی گیا تھا اس وقت ایران میں شاعرانہ مناظرہ ہوا کرتے تھے عرفی نے اس میں حصہ لینا شروع کیا اور بڑے بڑے شعراء پر غالب آیا اس قسم کے مباحثوں اور مناظروں سے عرفی کی علمیت اور فن شعر میں مہارت بہت بڑھ گئی لیکن اس کے ساتھ اس کے حاسد اور دشمن بھی پیدا ہو گئے۔ اور بقول خانی خان انہی دشمنوں کی ریشہ دوانیوں نے اس کو ترک وطن پر مجبور کر دیا۔ عرفی دریائی سفر اختیار کر کے سب سے پہلے جنوبی ہندوستان کے علاقہ دکن میں آیا دکن میں چند عرصہ رہنے کے بعد وہ فتح پور سیکری پہنچا۔ عبدالقادر بدایونی کے مطابق سیکری میں وہ فیضی کا مہمان ہوا مگر دونون میں ان بن ہوگئی اور عرفی عبدالفتح گیلانی کے دربار میں پہنچا۔ گیلانی کے انتقال کے بعد خانخاناں کے دربار سے منسلک ہو گیا۔ وقت کے فرمانروا سے

بے اعتنائی ناممکن تھی اس لئے عرفی نے اکبر کی مدح میں بھی قصیدہ لکھا اور شہزادہ سلیم کی فرمائش پر اس کی شان میں بھی قصیدہ لکھا۔ عرفی کی اکبر کے دربار میں رسائی ۹۹۷ھ میں ہوئی، اس وقت اس کی شاعری کا ڈنکا چاروں طرف بج رہا تھا اسلئے وہ اپنی شہرت کے باعث اکبر کے دربار میں پہنچا تھا نہ کہ فیضی کے توسط سے جیسا کہ کشن چند اخلاص نے لکھا ہے اور اس وقت عرفی کے فیضی سے تعلقات بہتر نہ تھے۔ عرفی دربار اکبری میں اس شان سے پہنچا کہ بقول شیر خان، ابوالفضل اور فیضی تک کو یہ خدشہ ہوا کہ کہیں اس کے آگے خود ان کا چراغ نہ گل ہو جائے۔ اس لئے وہ عرفی سے مخالفت پر مجبور ہو گئے لیکن عرفی کا تعلق دربار شاہی سے بہت کم رہا۔ عرفی کی زندگی کے آخری ایام لاہور میں گذرے اور وہیں اس کا انتقال بھی ہوا قیام لاہور کے حالات کسی بھی مصنف نے نہیں لکھے ہیں۔ کلیات عرفی کے بعض نسخوں میں عرفی کی کہی ہوئی ایک ہجو ملتی ہے جس میں اس نے اپنے معاصرین شعراء کی برائیاں کی ہیں کہ وہ لوگ محض دنیاوی دولت کے لئے اپنے ضمیر کو بیچ دیتے ہیں اور اپنی خودداری سے ہاتھ اٹھا لیتے ہیں ان لوگوں کی ملامت کی ہے ایک قطعہ جو اسی سلسلہ سے ہے اس کا مطلع یہ ہے:۔

فسانہ بشنو عرفی از من بیمار　　کہ باشدت بنفاق معاشران زہر

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے عرفی کا انتقال ۹۹۹ھ میں ہوا ہے عرفی کے انتقال کی وجہ کیا ہے اتنی کم عمر میں اس کا انتقال کیسے ہو گیا اس میں اختلاف ہے۔ نظام الدین احمد، تقی کاشی، عبدالنبی فخر الزمانی، عبدالباقی نہاوندی، امین احمد رازی ان سب نے اپنی تصانیف میں عرفی کی موت فطری طور سے ہوئی بتائی ہے اور یہ فطری موت مرض اسہال سے ہوئی ہے۔ لیکن بعض تذکرہ نگاروں نے عرفی کی موت کا سبب زہر دینا قرار دیا ہے۔ ابوالفتح نے عرفی کی موت کا سبب زہر اور فیضی کو مجرم قرار دیا ہے ان کی عبارت یہ ہے، ''فیضی آن بزرگوار را از راہ حسد مسموم نمودہ۔'' ان کے علاوہ خافی خان، شاہنواز خان اور حسین قلی خاں عاشقی نے بھی اپنی تصانیف میں زہر سے عرفی کی موت واقع ہونا قرار دیا ہے۔ کشن چند اخلاص نے لکھا ہے کہ عرفی کو مقبرہ میر حبیب اللہ میں دفن کیا گیا لیکن عرفی کی دعا بارگاہ امام میں مقبولیت پا چکی تھی اس لئے وہ نجف پہنچا اس کی خواہش اور پیشین گوئی تھی:۔

بکاوش مژہ از گور تا نجف بردم　　اگر بہ ہند ہلاکم کنی دگر بہ نثار

اور یہ پیشین گوئی اس کی آخر صحیح ثابت ہوئی اس کے مرنے کے ۲۸ سال بعد اس کی ہڈیاں ۱۰۳۷ھ میں نجف اشرف میں دفن کر دی گئیں۔ عرفی اپنے اخلاق و عادات میں اپنی بزرگ نسلی کی وجہ سے بہت بڑا تھا اس کا ضمیر انہیں لوگوں کی مدح کرنے کی اجازت دیتا تھا جو حقیقت میں مدح و ستائش کے لائق تھے اور ان کی مدح میں اپنی خوبیوں اور اچھائیوں کا بھی ذکر کر دیتا تھا اس نے اپنے شاعرانہ مرتبہ کو پہچانا (حقیقت میں اس زمانہ میں اس درجہ کا کوئی شاعر نہ تھا) چنانچہ بعض معاصرین نے اس کی خودداری کو غرور سمجھا خوشامد سے نفرت کو پند سمجھا اور اس کی فخریہ شاعری کو کوتاہ بینی قرار دیا۔ کچھ تذکرہ

نگاروں نے اس کی فطرت کے اوصاف کو اس کی ذات کے عیوب سمجھے اور اس کے اس انداز سے بہت شا کی ہیں لیکن تعجب ہے کہ فیضی جو اسکا سب سے بڑا حریف تھا اس نے عرفی کی شریف النفسی کی بہت تعریف کی ہے۔عرفی کے کلام میں ناہمواریاں اور خامیاں ہونے کے باوجود اکبر کے دور میں جتنی شہرت وعزت اس کو ملی اتنی کسی کو نصیب نہ ہوئی۔اس کے کلام میں کچھ جوہر بھی ہیں جو اس کو باقی اور زندہ رکھیں گے۔عرفی نے بہت سے نئے نئے استعارے اور نئی ترکیبیں ایجاد کی ہیں جس سے کلام پر کافی اثر پڑا اور اس میں شگفتگی اور نیا پن پیدا ہوا ہے۔ملاحظہ ہو:

☆ مریمی کن تو کہ فرزند مسیح اوست مسیح　　حاتمی کن تو کہ اقبال گدای ست و گدای

ناخن قدرت او پردہ تحقیق شگاف　　خامہ دولت او چہرۂ توفیق کشای

☆ بہ برقع مہ کنعان کہ بود حسن آباد　　بہ حجلہ گاہ زلیخا کہ بود یوسف زار

یہ ترکیبیں جس قدر بدیع ہیں اسی قدر مضمون میں زور اور وسعت پیدا کرتی ہیں۔جو رنگینی ان اشعار میں ہے وہ دیکھنے سے خود ہی ظاہر ہے۔عرفی سے پہلے یہ ترکیبیں ایجاد تھیں مگر عرفی نے اس میں چار چاند لگا دئے۔عرفی کا سارا کمال زور کلام اور فصاحت و بلاغت کا دریا دیکھنا ہو تو وہ وہاں نظر آئے گا جہاں پر اس کو ایک سلسلہ سے کوئی قصیدہ کہنا ہو۔جہاں کہیں عرفی کو ایک سلسلہ کا مضمون ملا ہے وہاں پر اس نے اپنے زور کو ضرور دکھایا ہے۔مثلاً خانخاناں کے جب بیٹا پیدا ہوا تھا تو ایک قصیدہ لکھا اس کی تمہید مسلسل مضامین کی عمدہ مثال ہے مطلع ملاحظہ ہو:

بود در کنم عدم بکر طبیعت را جائی　　کہ خرد بر سرش استادہ ہمی گفت برآئی

اسی طرح شہزادہ سلیم کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا جس کا مطلع حسب ذیل ہے وہ بھی مسلسل مضامین کی اچھی مثال ہے:

صباح عید کہ در تکیہ گاہ ناز و نعیم　　گدا کلاہ نمد کج نہاد و شہ دیہیم

جب ابوالفتح کے دربار میں ملازمت کرنا چاہا تو ایک قصیدہ کہہ کر لے گیا اور ایک اچھے پیرایہ میں اپنی ملازمت کے لئے یوں کہتا ہے قصیدہ کا مطلع ملاحظہ ہو جس میں ۱۷۔۱۱۶ اشعار بالکل تسلسل میں ہیں:

خدایگانا! دارم حکایتی برلب　　کہ چوں مدیح تو نتواندم بہ لب استاد

اسی قسم کی اور بہت سی مثالیں اس کے کلام میں موجود ہیں جن سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ وہ ایک واقعہ کو کس ترتیب اور تسلسل انداز اور شاعرانہ پیرایہ سے ادا کرتا ہے،زور کلام کی ابتداء اگرچہ نظامی نے کی تھی مگر عرفی نے اس کو کمال کے درجہ تک پہنچایا زور کلام لکھ کر بتانے والی چیز نہیں ہے یہ پڑھ کر خود سے اندازہ لگانے والی چیز ہے اس میں الفاظ کی شان وشوکت مضامین کا زور و بندش کی چستی کہ کتنے چست انداز سے الفاظ لکھے گئے ہیں۔یہ سب کلام میں زور پیدا کرنے کے لئے

ضروری ہیں عرفی کے کلام میں یہ تمام باتیں ملتی ہیں مثال کے طور پر:

چمن آید بہ چمن بہر تماشائے جمال　　بلبل آید بر بلبل بہ تمنائے غزال
مرحبا ای نظر بخت تو کیواں پرور　　مرحبائے گہر ذات تو امکاں آرائے

معشوق کا رعب اتنا زیادہ ہے کہ جس کی انتہا نہیں اس کو یوں ادا کیا ہے:

گفت جاہش دہر بر من تنگ شد　　چاک در افلاک وارکان می زنم

ممدوح اگر نعرہ جنگ کے میدان میں لگاتا ہے تو اس سے جوانوں میں بہادری کا جوش پیدا ہو جاتا ہے اس کو کہتا ہے:

اگر بصحن چمن فی المثل شجاعت او　　دہد نہیب کہ بیں یاسمیں دہان نرگس
چو عکس لالہ زند یاسمین در آب آتش　　چو شاخ بید کشد خنجر از میان نرگس

اس میں الفاظ کی بندش اور تشبیہ عکس لالہ اور شاخ بید ان سب سے کلام میں خوب زور پیدا کر دیا ہے۔ اسی طرح عرفی کی قوت تخیل بہت بلند تھی اس لئے بعض جگہ وہ بڑے نازک خیال سے کسی مضمون کو ادا کرتا تھا چونکہ اس کی مضمون آفرینی بھی اچھی تھی اس لئے وہ اس کی نازک خیالی میں ساتھ دیتی تھی۔ عرفی کے دور میں یہ عام رسم تھی کہ شاعر اپنی ساری قوت مبالغہ آمیزی جدت تشبیہ اور حسن تعلیل میں لگا دیتا تھا۔ عرفی بھی ان باتوں سے نہ بچ سکا، اگر شعراء اپنی قوت کو بجا طور پر کام میں لاتے تو ان کے کلام اور بہتر ہوتے یا شاعری کی حدیں اور بلند ہو جاتیں اور دور دراز تک پھیل جاتیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

آن کہ چون در کتف چتر ہمایوں آثار　　نم عنان ظفر از راہ غزا گردد باز
زہرہ گیسو بکشاید کہ شود گرد نشان　　از رکابش کہ پذیرفتہ غبار از تگ و تاز
فتح گوید چہ کنی چشم من است این رکاب　　سرمۂ چشم جہاں بین مرا پاک مساز

علامہ شبلی نے شعر العجم میں اس کا مطلب یہ لکھا ہے کہ رسول اللہؐ چتر کے سایہ میں میدان غزا سے واپس آتے ہیں تو زہرہ چوٹی کھول کر چاہتی ہے کہ رکابوں پر جو گرد پڑ گئی ہے اس کو جھاڑ دے فتح کہتی ہے یہ کیا کرتی ہے یہ رکاب ہی تو میری آنکھیں ہیں اس کے سرمہ کو کیوں چھڑاتی ہے یا ایک دوسری مثال ملاحظہ ہو:

احتساب تو اگر عارض نہی افروز　　ای مرا پردۂ عصمت تو راز ینت و ساز
زخمہ ہر چند کہ انگشت زند بر لب تار　　نغمہ از بیم نیارد کہ بر آورد آواز

عرفی کی مضمون آفرینی کا سب لوگ خواہ وہ دوست ہوں یا دشمن اقرار کرتے ہیں۔ عرفی کے محاسن میں یہ بھی ہے کہ وہ استعارات و تشبیہات کو جدید انداز سے بیان کرتا ہے اور جدت طرز ادا کا تو وہ بانی ہے جدت تشبیہ سے اس نے

گونا گوں عالم پیدا کر دیا ہے مگر بعض جگہ وہ بے مزہ اور بے لطف ہو گئے ہیں مگر اسی تشبیہ واستعارہ کو عرفی جس انداز سے ادا کر دیتا ہے بس اسی کا شیوہ ہے۔ حالانکہ عرفی کی جدت تشبیہ شاعری کے دیار کی نقش نگاری ہیں۔ ظاہر ہے جب کو کوئی مصور تصویر بناتا ہے تو کہیں نہ کہیں رنگ ضرور ہلکا ہو جاتا ہے وہی حال عرفی کا ہے اس سلسلہ کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

میر ابوالفتح کز سیاست او غمزۂ زہرہ خنجر اندازد
پرچم رحم تو در آشوب گاہ معرکہ لیلۃ القدر است در ہنگامہ یوم الحساب
ای برہمن چہ زنی طعنہ کہ در معبد ما سبحۂ نیست کہ آن غیرت زنار تو نیست

مثالوں سے واضح ہو جاتا ہے کہ جدت استعارات وتشبیہات کو عرفی نے کتنے اچھے طرز سے ادا کیا ہے۔ عرفی نے فخریہ شاعری بھی خوب کی ہے اس وقت شعرا کی یہ ہمت نہ تھی کہ وہ قصیدہ یا کسی بھی صنف شاعری میں اپنی تعریف کر سکے اگر قصیدہ میں بادشاہ کی تعریف ہو رہی ہے تو اس میں اپنا ذکر ہرگز نہیں لا سکتا مگر عرفی ہر قصیدہ میں اپنی تعریف ضرور کرتا تھا خواہ وہ کسی بادشاہ کی تعریف کرے یا امراء کی مدح میں کیوں نہ ہو چونکہ عرفی ایک خوددار انسان تھا اور اپنی اہمیت کو پہچاننے والا انسان تھا اور وہ صرف زمانہ کی مجبوریوں کی وجہ سے لوگوں کی مدح کرتا تھا مگر اپنے اوصاف اور خوبیوں کو بھی بیان کر دیتا تھا۔ مثلاً شہزادہ سلیم کی مدح میں کہے گئے قصیدہ میں اس بات کی طرف اشارہ بھی کرتا ہے:

خدایگانہ! گویم بہ مدح خویش دو بیت کزاں نیارد پرہیز کرد طبع سلیم

پھر اس کے بعد دو فخریہ شعر بھی کہے ہیں ابوالفتح گیلانی کی مدح میں کہے گئے قصیدہ میں اپنی تعریف یوں کرتا ہے:

سزد بجایزہ ماجیب پر گہر گردوں بدوشم افگنداین جامہ زمردفام

فخریہ شاعری میں اس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا اور نہ کوئی س کا ہمسر ہے وہ اپنی تعریف نئے نئے پیرایہ میں کرتا ہے۔ اگر چہ عرفی قصیدہ گو شاعر کی حیثیت سے مشہور ہے لیکن اس نے عشقیہ شاعری بھی کی ہے اس کی بناء یہ تھی کہ غالباً عشق ومحبت کے ہر راز سے واقف تھا۔ اس کی نگاہ میں سطحی اور سرسری وارداتیں کوئی اہمیت نہیں رکھتی ہیں بلکہ وہ دقیق معاملات پر نظر رکھتا تھا۔ عرفی نے کہیں عشق حقیقی کے اسرار بیان کئے ہیں تو کہیں عشق مجازی کی وارداتیں بیان کی ہیں حالانکہ عرفی قدرتی مناظر پر شیدا تھا خوبصورت چیزوں کا عاشق تھا اس لئے وہ اپنے محبوب کی تعریف میں کہتا ہے:

☆ دہن خویش ببوسند و لب و خویش مکند چوں آئینہ بینند ز بتاں صورت خویش
☆ عشق می گویم و می گریم زار طفل نادانم و اول سبق ست
☆ ہرگاہ کہ از لطف بہ کیں میل تو پیش ست اول نمک سینہ ما پاش کہ ریش ست
☆ این صفا عشق ومحبت زہم اندوختہ اند این دو شمع ست کہ از یک دگر افروختہ اند

☆ عرفی بحال نزع رسیدی و بہ شدی شرمت نیامد از دل امیدوار دوست

☆ رفت آن آفت جان از بزم ای ہوش بیا تا ببینم کہ چہا بر سر ایماں رفتہ است

غزل میں فلسفہ کو پیش کرنے والوں میں عرفی کا نام بلند ہے جتنے زیادہ فلسفیانہ خیالات عرفی نے بیان کئے ہیں اتنے کسی بھی ہندوستانی شاعر نے نہیں بیان کئے ہیں عرفی کی فلسفیانہ شاعری اس لئے اور بھی اچھی مانی جاتی ہے کہ اس نے فلسفہ کے نکتہ کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ شعر کے لطف کو برقرار رکھا ہے اگر کوئی فلسفہ کا مزہ لے تو اس کو اس کا مزہ ملے گا اگر کوئی شعر کا لطف لینا چاہے تو اس کو وہ ملے گا۔ عرفی نے اپنے کلام میں فلسفہ کے دقیق مسائل بھی بیان کئے ہیں حالانکہ سحابی، ناصر خسرو جیسے لوگوں نے بھی فلسفہ کے دقیق نکتہ بیان کئے ہیں مگر یہ لوگ شعر کے لطف کو برقرار نہ رکھ سکے صرف فلسفہ کا وجود ملے گا جو نظم کی شکل میں ہوگا عرفی اپنی اسی خصوصیت کی وجہ سے فلسفی شاعروں میں زیادہ اچھا مانا جاتا ہے مثالیں ملاحظہ ہوں:

حدگنہ تو بہ ادراک نشاید دانست ویں سخن نیز باندازہ ادراک من است

عرفی چونکہ اخلاق و عادات کا اچھا آدمی تھا جیسا کہ فیضی نے بھی لکھا ہے اسلئے عزت ضمیر کی بلندی کی تعلیم دیتا تھا تو کہیں نیک اعمال کے لئے کہتا ہے غرض کہ اس نے اخلاق کے سبھی مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ بھی کہتا ہے فتح حاصل کرو مگر دوسروں کا دل نہ دکھے کسی کے ساتھ ناانصافی نہ کرو خود آزاد رہو اور دوسروں کو آزاد رہنے دو۔ عرفی سے پہلے عزت نفس، بلند ہمتی اور بلند ضمیر کے مضمون بہت کم تھے مگر عرفی نے ان سب کے متعلق شعر کہے ہیں اونچے اور اعلیٰ حوصلہ کے لئے یوں کہتا ہے:

☆ رستم ز مدعی بقبول غلط ولے در تابم از شکنجہ و طبع سلیم خویش

☆ زخمہا برداشتم و فتح ہا کردیم لیک ہرگز از خون کسے رنگین نشد دامان ما

☆ حسد تہمت آزادی سرودم بگداخت کیں مرادلبت کہ برتہمتاں ہم جسدست

کتابیات:۔

۱۔ خان، عابد علی۔ عرفی شیرازی۔ ادبیات و زبانہا۔ ہلال۔ فروردین ۱۳۴۵۔ شمارہ ۵۴

۲۔ عبدالرحمن، سید صباح الدین۔ بزم تیموریہ۔ جلد اول۔ دارالمصنفین شبلی اکیڈمی۔ اعظم گڑھ۔ ۲۰۱۱ء

۳۔ عرفی شیرازی، جمال الدین محمد۔ دیوان ۲ جلد۔ مرتبہ محمد ولی الحق انصاری۔ انتشارات دانشگاہ تہران۔ تہران۔ ۱۳۷۸

۴۔ نعمانی، علامہ شبلی۔ شعرالعجم۔ جلد سوم۔ دارالمصنفین شبلی اکیڈمی۔ اعظم گڑھ۔ ۲۰۱۲ء

☆☆☆

غبار خاطر: مشعل راہ زیست

ڈاکٹر سکینہ امتیاز خان، صدر شعبہ فارسی، ممبئی یونیورسٹی، ممبئی

مولانا ابوالکلام آزاد جیسی عظیم المرتبت شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ ان کی زندگی تحریک وتحریر دونوں حیثیتوں کی جامع تھی۔ ان کی سیاسی زیست کے طوفانی حوادث نے انہیں ۱۹۴۲ء میں جیل کے دروازے تک پہنچا دیا اور تقریباً تین سال تک آزاد، قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتے رہے۔ اس قید و بند کے ماحول میں آزاد کی ادبی وفنی مزاج کی آزادی رہی، ان کی علمی وفکری طبیعت میں ہیجان پیدان ہوگیا اور دل کا قرار چھن سا گیا۔ اسیری کے دوران سکون قلب کی رسائی کے لئے آزاد نے اپنے علمی وادبی دوست نواب صدر یار جنگ بہادر، مولانا حبیب الرحمان خان شیروانی کے نام خطوط لکھنا شروع کر دئے۔ اور پھر کیا تھا جب جی چاہا اپنے صدیق مکرم کو مخاطب کرتے ہوئے ان مکاتیب میں اپنے دل کا غبار قلم بند رہے:

اب لکھیں گے شکوۂ بیداد ہم دل کھول کر نام اس کا آسماں ٹھہرا لیا تحریر میں (نواب یوسف علی خاں ناظم)

ان کا یہ سلسلہ مکتوب نگاری تا رہائی جاری رہا اور رہائی کے بعد مئی ۱۹۴۶ء میں ان خطوط کا پہلا مجموعہ بنام ''غبار خاطر'' منظر عام پر آیا اور دنیائے ادب وفن میں آزاد کا یہ شاہکار نثر نگاری کی ایک بہترین مثال بن گیا۔ میں، ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد کی اس بات سے میں اتفاق رکھتی ہوں کہ بظاہر آزاد نے اپنے مکاتیب میں مولانا حبیب الرحمان خاں شیروانی کو مخاطب کیا ہے لیکن ''مکتوب نگار میں ہر وقت یہ خیال کارفرما رہتا ہے کہ وہ صرف مکتوب الیہ ہی سے مخاطب نہیں ہے بلکہ اور بھی لوگ ہیں جو اس کی باتوں کو سن رہے ہیں اور اسے دیکھ رہے ہیں۔(۱)'' میرے زاویہ نگاہ سے گویا آزاد خود بھی یہ اعتراف کرنا چاہتے ہیں کہ:

غبار دل من بنام شما است پیام و اشارہ برای جہانست

اپنی اسی فکر کے زیر اثر ''غبار خاطر میں مولانا نے جو کچھ بھی لکھا ہے اسے احتیاط کی چھلنی میں انہوں نے اچھی طرح چھان لیا ہے اور ان کے افکار کا بہاؤ انہیں راستوں سے ہوتا ہوا گزرتا ہے جو متعین منزل مقصود کی طرف پہنچتا ہے(۲)۔'' آزاد کی سیاسی وتحریکی زندگی ان کے علمی وادبی ذوق پر حاوی ہونے کی مسلسل کوشش کرتی رہی لیکن آزاد نے ہر ممکن کوشش کی کہ وہ اپنی تخلیقی زندگی کو ہمیشہ اس سے علیحدہ رکھیں۔ آزاد کے خطوط میں ان کی زندگی کا عکس ومطالعہ نظر آتا ہے انہوں نے زندگی کو جس طرح برتا اور جس رنگ میں دیکھا ہے اسے تمام تر داخلی کیفیات کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔ مکتوبات آزاد کا ہر لفظ

ان کے ذاتی تجربات، مشاہدات، تجزیات، زندگی کی عکاسی کرتے ہوئے جابجاان کی انفرادی شخصیت کی غمازی بھی کرتا ہے:

ما از بلند و پست جہاں در گذشتہ ایم از بسکہ دیدہ ایم نشیب و فراز را (شبلی)

صد بیاباں بگذشت و دیگرے در پیش است (فیضی)

آزاد نے اپنی زندگی دو مختلف و متضاد حالتوں میں بسر کی۔ زندگی کے کچھ پل قید خانے کے باہر کی دنیا کے حوالے کر دئے تو کچھ لمحوں پر روزگار اسیر کے حاکم نے اپنی مہر لگا دی تھی۔ لیکن آزاد کی طبع انفرادی نے اس وقت بھی ان کا ساتھ نہیں چھوڑا اور ہر وقت جلوہ افروز رہی۔ آپ اسیری کے دوران بھی اس دور کے دستور العمل کی کامل طور سے پیروی کرتے رہے جس کا نعرہ خیام کی اس رباعی کی عین ترجمانی کرتا نظر آتا ہے:

خیام اگر ز بادہ مستی خوش باش گر صنمی نشستی خوش باش

پایان ہمہ عمر جہان نیستی پندار کہ نیستی چو ہستی خوش باش

اس دور اسیری کا دستور العمل کچھ اس طرح تھا کہ ہر وقت خوش رہو اور ہر ناگوار حالت کو خوشگوار بناؤ۔ اور آزاد خلوص قلب کے ساتھ اس پر عمل پیرار ہے، لکھتے ہیں:

''میری پچھلی زندگی مجھے قید خانے کے دروازے تک پہنچا کر واپس چلی گئی اور اب ایک دوسری ہی زندگی سے سابقہ پڑا ہے۔ جو زندگی کل تک اپنی حالتوں میں گم اور خوش کامیوں اور دل شگفتگیوں سے بہت کم آشنا تھی آج اچانک ایک ایسی زندگی کے قالب میں ڈھل گئی جو شگفتہ مزاجیوں اور خندہ روئیوں کے سوا اور کسی بات سے آشنا نہیں۔ (۳)''

آزاد کے نقل بالا سطور ایک پل کے لئے ہمیں چونکا دیتے ہیں اور یہ سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں کہ آیا وہ یقیناً قید خانہ ہی کی زندگی کا تذکرہ کر رہے ہیں جو کہ حقیقتاً عیش و عشرت کی دنیا سے بعید ایک تاریک، تنگ دست، مایوس کن، بے رنگ و محروم زندگی کا تصور دیتی ہے اور شگفتہ مزاجی و خندہ روئی سے آشنائی جیسے الفاظ قید و بند کی زندگی سے سراسر لاتعلقی ظاہر کرتے ہیں لیکن دوسرے ہی پل یہ آزاد کی انفرادی شخصیت کے اوراق پلٹتے ہوئے ان کے احساسات کی صداقت کا یقین دلا دیتے ہیں:

ہنگام تنگ دستی در عیش و کوش مستی کین کیمیائی ہستی قارون کند گدارا

غبار خاطر کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ آزاد بھی یقیناً حافظ کے بالا شعر پر یوین رکھتے ہوں گے اس کے زیر اثر آپ نے قید و بند کی با مشقت زندگی کو سعادت بھری زندگی کے قالب میں با آسانی ڈھال دیا تھا بلکہ اپنے ایک خط میں غالب کے اس شعر کو نقل کر کے قفس جیل میں بے پر و بالی کے غم و ماتم سے اپنی بے پروائی بھی ظاہر کی ہے:

ہوس گل کا تصور میں کھٹکا نہ رہا عجب آرام دیا بے پر و بالی نے مجھے

آزاد لکھتے ہیں کہ ''ہم خود خوش ہو کر دوسروں کو خوش کرتے ہیں اور دوسروں کو خوش دیکھ کر خود خوش ہونے لگتے ہیں (۴)۔'' جاوید نامہ میں اقبال نے اس جہان ہفت رنگ کے آدمی کی تصویر کچھ اس طرح کھینچی ہے۔

آدمی اندر جہان ہفت رنگ ہر زماں گرم فغاں مانند چنگ (اقبال)

اس امر کی طرف آزاد ہماری توجہ مبذول کروانا چاہتے ہیں کہ ہماری کوئی خوشی بھی ہمیں خوش نہیں کر سکے گی اگر ہمارے چاروں طرف غمناک چہرے اکٹھے ہو جائیں گے۔ اسی لئے آزاد نے زندگی کو ایک آئینہ خانہ سے تشبیہ دی ہے۔ فرماتے ہیں:

''یہاں ہر چیز کا عکس بیک وقت سیکڑوں آئینے میں پڑنے لگتا ہے اگر ایک چہرے پر بھی غبار آ جائے گا تو سیکڑوں چہرے غبار آلود ہو جائیں گے۔ ہم میں سے ہر فرد کی زندگی محض ایک انفرادی واقعہ نہیں ہے وہ پورے مجموع کا حادثہ ہے (۵)۔''

ہمیشہ اور ہر حال میں خود کو خوش رکھنے اور خوش رہنے کی اہمیت و افادیت پر زور دیتے ہوئے آزاد ہمیں تلقین کرتے ہیں کہ خوش رہنا محض ایک طبعی ضرورت نہیں بلکہ ہماری ایک اخلاقی ذمہ داری بھی ہے۔ ''اس لئے ہمارا اخلاقی فرض ہوا کہ خود افسردہ خاطر ہو کر دوسروں کو افسردہ خاطر نہ بنائیں (۶)۔'' ملک الشعرا بہار نے قصائد بہار میں اپنے اسی خیال کا اظہار کچھ اس انداز میں کیا ہے:

شو منفجر ای دل زمانہ و آن آتش خود نہفتہ مپسند
خامش منشین سخن ہمی گوئی افسردہ مباش خوش ہمی خند

فلسفۂ زندگی پر بحث کرنا کوئی مختصر موضوع نہیں ہے جبکہ بقول آزاد فارسی کے ان دو مصرعوں نے فلسفہ حیات ختم کر دیا تھا:

موجیم کہ آسودگی ما عدم ماست مازندہ از انیم کہ آرام نگیریم (آتش)

ان کا نظریہ تھا کہ ''ہماری زندگی کی حقیقت بھی حرکت و اضطراب کے تسلسل کے سوا کچھ نہیں (۷)۔'' سلسلہ حرکت و عمل سے ہی زندگی کی بقا ہے جس کو علامہ اقبال نے بھی اپنے کلام میں اہمیت دی ہے۔ ساتھ ہی آزاد ہمیں یہ بھی سمجھانا چاہتے ہیں کہ بغیر کسی مقصد، بغیر کسی جستجوے منزل کے ایک کامل، کامیاب و مثالی زندگی نہیں گزاری جا سکتی، ایک بار اپنی زندگی کے کچھ لمحے، اپنی کچھ سانسیں کسی منزل کی رسائی و مقصد کے حصول کی آرزو و جستجو میں صرف کر کے کامیابی و کامرانی کے اس جام لطیف کا مزہ اٹھائیں جسے ہر کوئی محسوس نہیں کر سکتا۔ یہ سعادت انہیں چند لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو حقیقت زیست کے مفہوم کا علم رکھتے ہیں غافل اس لذت سے یکسر محروم ہیں آزاد لکھتے ہیں:

''یہاں پانے کا مزہ انہی کو مل سکتا ہے جو کھونا جانتے ہیں جنہوں نے کچھ کھویا ہی نہیں انہیں کیا معلوم کہ پانے کے معنی کیا ہوتے ہیں (۸)۔''

اپنے ایک خط میں چڑیا اور چڑے کی کہانی کے حوالے سے بڑی سادگی و آسانی سے ہمیں اس بات کا یقین دلانے کی کوشش کی ہے کہ ''نامردی و مردی قدمے فاصلہ دارد'' جس کسی نے اس کارگاہ عمل میں بغیر کسی خوف و تذبذب کے زندگی کی راہ میں ہمت و جرأت کا وہ سب سے پہلا مشکل قدم بڑھا لیا تو سمجھ لیجئے کہ زندگی کی تمام راہیں اس کے لئے ہموار ہوگئیں۔ آزاد رقم طراز ہیں:

''اس بزم سود و زیاں میں کامرانی کا جام کبھی کوتاہ دستوں کے لئے نہیں بھرا گیا وہ ہمیشہ اسی کے حصے میں آیا جو خود بڑھ کر اٹھا لینے کی جرأت رکھتے تھے۔ شاد عظیم آبادی نے ایک شعر کیا خوب کہا:

یہ بزم مئے ہے، یاں کوتاہ دستی سے ہے محرومی جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے' (۹)

آزاد نے اپنی زندگی کا ایک بھی لمحہ غفلت، فراموشی، یا خود گریزی میں نہیں گذارا، ہمیشہ برسر پیکار رہے۔ آزاد اپنے ایک خط میں کچھ اس طرح محو گفتگو ہیں کہ وہ زندگی ہی کیا جو ایک ہی طرح کی صبحوں اور ایک ہی طرح کی شاموں میں بسر ہوتی رہے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے پہلی بار ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک مرکز پر جمع ہونے کی دعوت دی، اور برطانوی طاقت کے استحصال کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک متحدہ نصب العین کی ضرورت کا احساس دلایا۔

''مولانا آزاد تقریباً نصف صدی تک اپنے انفاس گرم سے مردہ دلوں میں زندگی پھونکتے رہے، انہوں نے اپنے نور بصیرت سے تاریک تر دماغوں کو منور بھی کیا اور اپنی ہدایت و رہنمائی سے گم کردہ راہوں کو راہ راست دکھلایا۔ (۱۰)''

آزاد اس فکر کے قائل تھے کہ انسان کا اصل عیش جسم کا نہیں بلکہ دماغ کا عیش ہے پروین اعتصامی نے بھی خوب کہا ہے:

خرم آن کس کہ درین محنت گاہ خاطری را سبب تسکین است

انسان کے جسم کو تو قید کیا جا سکتا ہے لیکن اس کے تخیل پر کسی طرح کی پابندی عاید نہیں کی جا سکتی۔ ہمارے دل و دماغ پر صرف اور صرف ہماری حکومت چلتی ہے۔ ہم خود مختار ہیں، چاہیں تو اپنی منفی سوچ سے کانٹوں کے فرش در فرش بچھا دیں یا اپنی مثبت طرز فکر سے اپنے لئے ایک راحت بخش راستہ بنا لیں۔ آزاد ایک مثبت شخصیت کے حامل تھے انہوں نے اپنی زندگی میں کانٹوں کے فرش کو اپنے ارادے کی پختگی اور مثبت تخیل کی مدد سے شبستان راحت بنا لیا تھا۔ شاید انگریزی کے اس مقولے پر یقین رکھتے ہوں:

"A Negative Mind Will Never Give You a Positive Life."

جیسا کہ آزاد کے اس قول سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

''کھانے پینے اور ساز وسامان کی تکلیفیں ان لوگوں کو پریشان نہیں کرسکتیں جو جسم کی جگہ دماغ کی زندگی بسر کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔آدمی اپنے آپ کو احساسات کی عام سطح سے ذرا بھی اونچا کرے تو پھر جسم کی آسایشوں کا فقدان اسے پریشان نہیں کر سکے گا۔ ہر طرح کی جسمانی راحتوں سے محروم رہ کر بھی ایک مطمئن زندگی بسر کردی جاسکتی ہے۔''(۱۱)

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ بات واضح ہے کہ آزاد نے جسمانی راحت پر روحانی سکون کو ترجیح دی ہے،ان کی فکر ان کی مثبت سوچ کے ماتحت تھی اسیری کی چار دیواری میں بیٹھ کر زندگی کے مثبت پہلوؤں پر غور وفکر کرنا انہیں کا کمال تھا۔

دریں کلبہ من قصر شاہی میسازم ببین در گدای شہ دو جہانم

اپنے ایک خط میں آزاد حکایت زاغ وبلبل کے حوالے سے ہمیں مثبت سوچ کے ساتھ ساتھ صبر وشکیب کی تلقین ان الفاظ میں دیتے ہیں:

''طلب ونیاز کی راہ میں قدم اٹھایا ہے تو عشوہ وناز کی تغافل کیشیوں کے لئے صبر وشکیب پیدا کریں۔(۱۲)''

لیکن یہ بھی درست ہے کہ انسان ہر وقت عقل وذہن کے اشارے پر نہیں چل سکتا کبھی کبھی نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے صبر وضبط کے دامن کی پکڑ ڈھیلی پڑ جاتی ہے اور نتیجتاً طبیعت میں افسردگی آجاتی ہے۔

خزاں کیا فصل گل کہتے ہیں کس کو،کوئی موسم ہو وہی ہم ہیں،قفس ہے اور ماتم بال وپر کا ہے(غالب)

بقول آزاد طبیعت افسردہ ہوجاتی ہے تو الفاظ افسردہ نکلتے ہیں بہر حال آزاد کا بھی انسانی مزاج کروٹیں لیتا رہا۔ لیکن یہ کہنا قطعی غلط نہ ہوگا کہ ان کے لئے دنیا کا کوئی بھی مرض لا علاج نہیں تھا۔علالت آئی نہیں کہ مداوا تیار کرلیا اپنی طبیعت کی افسردگی کے معالجے میں بھی جیل کی سلاخیں ان کے لئے کبھی رکاوٹ نہیں بنیں بلکہ وہاں بھی کا چائے کا پیالہ ان کے لئے کارگر ثابت ہوا۔لکھتے ہیں:''میں طبیعت کی افسردگیوں کا چائے کے گرم جاموں سے علاج کیا کرتا ہوں آج قلم کو بھی ایک گھونٹ پلا دیا۔(۱۳)'' چائے کے گرم جاموں سے افسردگی کو الوداع کہتے ہوئے پھر اسی جوش وخروش کے ساتھ خامہ فرسائی میں جٹ گئے۔

برخیزم وزندگی زسر گیرم وین رنج دل از میانہ برگیرم (بہار مشہدی)

آزاد نے اپنے مثبت زاویہ نگاہ سے انسان کے اس نقطہ نظر کو تبدیل کرنے کی کوشش کی ہے جو یہ سوچتا ہے کہ وہی آدمی سب سے زیادہ مذہبی،فلسفی اور اخلاقی قسم کا ہوگا جو ایک بجھا دل اور سوکھا چہرہ لے کر پھرتا ہو جب کہ آزاد کی نظر میں:

''فطرت کی اس بزم نشاط میں تو وہی زندگی سج سکتی ہے جو ایک دہکتا ہوا دل پہلو میں اور چمکتی ہوئی

پیشانی چہرے پر رکھتی ہواور جو چاندنی میں چاند کی طرح نکھر کر ستاروں کی چھاؤں میں ستاروں کی طرح چمک کر پھولوں کی صف میں پھولوں کی طرح کھل کر اپنی جگہ نکال لے سکتی ہو(۱۴)۔''

اسی طرح غبار خاطر میں آزاد نے انسان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے روشناس کرانے کی کوشش کی ہے ساتھ ہی انسانی فطرت کی کڑوی سچائی اور قدرت کی دادگری سے باخبر کرایا ہے۔ان کی نگاہ میں فطرت کبھی انسانوں کی طرح جانبداری نہیں برتتی اس کا انصاف تمام کائنات کے لئے یکساں ہے بلکہ،''یہ ہماری غفلت اندیشی ہے کہ نظر اٹھا کر دیکھتے نہیں اورصرف اپنے گردوپیش ہی میں کھوئے رہتے ہیں۔(۱۵)'' آزاد نے درست فرمایا ہے یہ انسانی فطرت ہے کہ غفلت اندیشی کے سبب قدرت کو ہی اپنی ناکامی ومحرومی کا ذمہ دار ٹھہراتی ہے اور خود کو قدرت کی مظلومی کا شکار۔زندگی کی چھوٹی موٹی آزمائشوں سے اکتا کر، ماتم حال خود کرتے ہوئے انسان زبان شکوہ سے کہہ اٹھتا ہے۔

چرخ ہرسنگ داشت برمن زد دیگرش سنگ درفلاخن نیست (پروین اعتصامی)

اس منفی سوچ کے برخلاف آزاد کی زندہ دل تحریر کا ایک نمونہ دیکھیں:

''عیش ومسرت کی جن شگفتگیوں کو ہم چاروں طرف ڈھونڈتے ہیں اورنہیں پاتے، وہ ہمارے نہانخانہ دل کے چمن میں ہمیشہ کھلتے اور مرجھاتے رہتے ہیں لیکن محرومی ساری یہ ہوئی کہ ہمیں چاروں طرف کی خبر ہے مگر خود اپنی خبر نہیں۔

طے میشود این رہ بدرخشیدن برقی مابیخبر منتظر شمع وچراغیم (علی قلی بیگ انیس شاملو)۱۶''

خودشناسی کا پیغام دیتے ہوئے آزاد نے اپنے ایک خط میں بہت عمدہ مثال نقل کی ہے صرف نظر ہے:

''جنگل کے مور کو کبھی باغ وچمن کی جستجو نہیں ہوتی اس کا چمن خود اس کی بغل میں موجود رہتا ہے جہاں کہیں اپنے پر کھول دے گا ایک چمنستان بوقلموں کھل جائے گا۔(۱۷)''

آزاد نے اپنی زندگی کے سفر میں کامرانیوں کا سہرا اپنے دل زندہ کو باندھا ہے اور اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ،''باہر کے ساز وسامان چھن جائیں لیکن جب تک یہ نہیں چھنتا میرے عیش وطرب کی سرمستیاں کون چھین سکتا ہے؟(۱۸)۔''

مجھے ڈر ہے دل زندہ! تو نہ مرجائے کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے (دردؔ)

عصر جدید کے ایک نامی شاعر رشید یاسمی نے بھی دل کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار بخوبی کیا ہے۔

چودل ہیچ عضوی وفادار نیست ازانروو فارادل آمد وطن

آزاد اس سوچ کے قائل تھے کہ ایوان محل نہ ہوں تو کسی درخت کے سائے سے کام لیا جاسکتا ہے۔دیبا ومخمل کا

فرش میسر نہ ہو تو سبزہ خودرو کے فرش پر بیٹھا جا سکتا ہے۔ اسی طرح سے اگر دنیا کی ساری مصنوعی خوشنمائیاں غائب ہو جائیں تو اس کا بدل ہم ڈھونڈ سکتے ہیں سوائے زندہ دل کے۔ آزاد ہم تک یہ پیغام پہنچانا چاہتے ہیں کہ زندگی کی ساری خوشیاں اور رونقیں صرف اس کے دم سے ہے اسے کبھی مرنے نہ دیں اپنے دل کے چراغ کو ہمیشہ روشن رکھیں کیونکہ اس کی جلا سے زندگی کی تاریکیوں کو منور کرتے ہوئے ایک خوش وخرم زندگی بآسانی گذاری جا سکتی ہے۔

بہ نگاہ آزاد جس کسی نے زندگی کے اس کانٹوں بھرے بیابان میں خوش رہنے کا ہنر سیکھ لیا تو مان لو اس نے زندگی کا سب سے بڑا کام انجام دے دیا اور ہر حال میں زندہ رہنا مر جانے سے بھی مشکل کام ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''لوگ ہمیشہ اس کھوج میں لگے رہتے ہیں کہ زندگی کو بڑے کاموں کے لئے کام میں لائیں لیکن نہیں جانتے کہ یہاں ایک سب سے بڑا کام خود زندگی ہوئی یعنی زندگی کو ہنسی خوشی کاٹ دینا۔ یہاں اس سے زیادہ سہل کام کوئی نہ ہوا کہ مر جایئے اور اس سے زیادہ مشکل کام کوئی نہ ہوا کہ زندہ رہیے۔ جس نے مشکل حل کر لی اس نے زندگی کا سب سے بڑا کام انجام دے دیا۔(۱۹)''

ہمہ جا تیرہ وتاریک، پژمردہ، نفس بی رنگ مگر نامش دل زندہ چو ہست اینجا خوش وخرم

غبار خاطر کے تمام خطوط اور ان میں استعمال کئے گئے عظیم شعراء کے تقریباً تمام اشعار نے مجھے کافی متاثر کیا لیکن آزاد کے ایک فقرہ نے میرے قلم کو ساکت کر دیا اس پر نظر پڑتے ہی قلم کو مزید حرکت دینے کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ ایسا محسوس ہوا ہے جیسے غبار خاطر کا خلاصہ اسی ایک فقرہ میں سما گیا ہو۔ اگر اس فلسفیانہ فقرہ کی تاثیر انسانی فہم میں آ گئی تو میں یقین کے ساتھ کہتی ہوں کہ آئندہ کسی اور غبار خاطر یا پند نامہ جیسی اخلاقی کتابیں تحریر کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی، آزاد کا وہ شاہکار فقرہ: ''خود ہماری ہستی ہی سرتاسر نشان راہ ہے۔(۲۰)''

﴿حواشی﴾

(۱)۔غبار خاطر کا تنقیدی مطالعہ، ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد، ص ۵۹۔(۲)۔ایضاً۔ص ۶۱۔(۳)۔غبار خاطر از ابوالکلام آزاد، مرتبہ مالک رام، ص ۶۶۔(۴)۔ایضاً۔ص ۴۷۔(۵)۔ایضاً۔(۶)۔ایضاً۔(۷)۔ایضاً، ص ۴۵۔(۸)۔ایضاً (۹)۔ایضاً، ص ۲۱۸۔۲۱۷۔(۱۰)۔مولانا آزاد کی فارسی خدمات، ڈاکٹر شاہد نوخیز اعظمی، ص ۱۴۔(۱۱)۔غبار خاطر از ابوالکلام آزاد، مرتبہ مالک رام، ص ۸۷۔(۱۲)۔ایضاً، ص ۱۹۰۔(۱۳)۔ایضاً، ص ۱۰۶۔(۱۴)۔ایضاً، ص ۷۶۔ (۱۵)۔ایضاً، ص ۶۹۔(۱۶)۔ایضاً، ص ۶۸۔(۱۷)۔ایضاً۔(۱۸)۔ایضاً، ص ۷۰۔(۱۹)۔ایضاً، ص ۷۳۔(۲۰)۔ایضاً، ص ۱۲۹

ہم دلی ہم زبانی سے بہتر ہے

ڈاکٹر نکہت فاطمہ، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ فارسی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، لکھنؤ کیمپس، لکھنؤ

ہندوستان میں مسلمانوں کے آمد کے بعد ہی مختلف صوفی سلسلوں کے بزرگوں کی یہاں آمد شروع ہوگئی تھی۔ اسلامی دنیا کے مختلف علاقوں سے آنے والے ان صوفیائے اکرام نے ہندوستان کے مختلف حصوں اور مقامات کو اپنی تبلیغی کاوشوں کو بروئے کار لانے کے لئے منتخب کیا۔ خواجہ معین الدین چشتی اجمیر میں، شیخ فریدالدین گنج شکر اجودھن پاک پٹن میں، شیخ بہاؤالدین زکریا ملتان میں، شیخ نظام الدین اولیا دہلی میں، سیّد محمد گیسودراز دکن میں، میر علی سیّد ہمدانی کشمیر میں، شیخ جلال تھانیسر میں وغیرہ۔ اس طرح یہ صوفیائے اکرام ہندوستان کے ان مختلف مقامات میں اسلام کی روشنی پھیلانے اور آداب وفرہنگ کی ترویج میں صمیم قلب سے مصروف ہوگئے اور مولانا روم کے اس پیغام پر عمل پیرا ہوئے:

تو برای وصل کردن آمدی　　نی برای فصل کردن آمدی (۱)

صوفیائے اکرام کا بنیادی فکر ونظر ہمیشہ سے انسان اور خدا کے درمیان ربط وتعلق قائم رکھنا رہا ہے۔ ان کا اعتقاد تھا کہ صرف عشق ومحبت سے ہی ایک دوسرے سے روابط استوار کیے جاسکتے ہیں۔ ان کا عقیدہ تھا کہ خدا کے ساتھ عشق و محبت انسان کے ساتھ دوستی، ہمدلی، خدمتگذاری کے بغیر ممکن نہیں ہے، صوفیائے اکرام دوسرے علماء کی مانند عام لوگوں سے دور اور الگ نہیں رہے۔ اگر چہ تمام صوفیاء عربی اور فارسی زبان میں دسترس اور تبحر رکھتے تھے، لیکن پھر بھی عشق خداوندی، بھائی چارہ، انسانیت نوازی کی تبلیغ وترویج میں انہوں نے عام بول چال کی زبان کا سہارا لیا اور عام لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی۔

صوفیائے اکرام نے انسانوں سے رنگ ونسل، مذہب اور دیگر امتیازات کو نظرانداز کر کے تمام انسانوں سے محبت کی۔ ان کی بھلائی اور بہبودی کے لئے لگاتار کوشاں رہے۔ ان کے ملفوظات کا مطالعہ کریں تو ایسے بے شمار واقعات و حکایات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ صوفیاء نے معاشرہ میں ایسا ماحول پیدا کرنے کی کوششیں کیں جس میں تمام انسان بلا کسی تفریق مذہب وملّت صلح وآشتی سے زندگی بسر کرسکیں۔ فارسی کے عظیم شاعر شیخ سعدی شیرازی اس بات کو ان اشعار میں بیان کرتے ہیں:

بنی آدم اعضای یکدگرند　　کہ در آفرینش ز یک جوہرند
چو عضوی بدرد آورد روزگار　　دگر عضوھا را نماند قرار

تو کز محنت دیگران بی غمی نشاید کہ نامت نہند آدمی (۲)

(بنی آدم کی اولاد انسانی جسم کے مختلف اعضاء کی مانند ہیں۔ جس طرح جسم کا ایک حصہ تکلیف میں مبتلا ہوتا ہے تو دوسرے حصے جنہیں بظاہر کوئی بیماری لاحق نہیں ہوئی، درد محسوس کرتے ہیں۔ اے انسان اگر تو دوسروں کی تکلیف سے لاپرواہ ہے، دوسروں کے غم تجھ کو غمگین نہیں کرتے تو مناسب نہیں کہ تجھے آدمی اور انسان کہا جائے۔)

ان صوفیائے اکرام کی خانقاہیں ہر وقت کھلی رہتی تھیں۔ ہر قسم کے لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور وہ ہر ایک کے دل کو سکون اور اطمینان پہنچانے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کی خانقاہیں محبت اور دلنوازی کا ایسا مرکز بن گئی تھیں جہاں پہنچ کر ہر شخص خواہ چھوٹا ہو یا بڑا، اپنی تمام تکالیف بھول جاتا تھا اور اس کا دماغ وہاں کی فضا کے اثرات قبول کرنے پر خود بخود آمادہ ہو جاتا تھا۔ ہر نئے اور پرانے آنے والے کے ساتھ یکساں برتاؤ کیا جاتا تھا۔ نئے آنے والے کو کسی بھی قسم کی اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ جیسا کہ حافظ شیرازی کہتے ہیں:

آسایش دو گیتی تفسیر این دو حرفست با دوستان مروّت با دشمنان مدارا (۳)

(دونوں جہان کی راحت ان دو حروف کی تفسیر ہے۔ دوستوں کے ساتھ مہربانی اور دشمنوں کے ساتھ مدارات۔)

شیخ فرید الدین گنج شکر کی مجلس کا بھی یہی حال تھا۔ اگر کبھی خانقاہ میں کوئی شخص ایسا آتا جو اس سے پہلے کبھی نہیں آیا تھا اور اس وقت کسی ایسے شخص کی حاضری ہوتی جو برسوں کا واقف کار ہوتا تو دونوں کے ساتھ یکسان بات چیت ہوتی اور توجہ و مہربانی دونوں پر یکسان کی جاتی۔

''اگر کسی بہ خدمت بیامدی کہ ھرگز نیامدہ بودی و دیگری نیز حاضر بودی کہ او آشنای چندین سالہ بودی در محاورہ با ھر دو برابر بودی و در تلطف و توجہ با ھر دو متساوی۔'' (۴)

شیخ فرید کو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی کہ ہر وقت عقیدتمند ان کے گرد جمع رہتے تھے۔ آدھی رات تک خانقاہ کا دروازہ کھلا رہتا تھا۔ شیخ نظام الدین اولیا کا بیان ہے:

''بخدمت شیخ الاسلام فرید الدین رحمۃ اللہ علیہ رحمۃً واسعۃً از ھر جنسی درویش و غیر آن برسیدی۔'' (۵)

شیخ صاحب ہر شخص سے اس کی صلاحیت کے مطابق گفتگو فرماتے۔ امیر و غریب کا ان کے یہاں کوئی فرق نہیں تھا۔ شیخ فرید کے خادم، خلیفہ اور داماد شیخ بدر الدین اسحاق فرماتے ہیں:

''من خادم محرم بودم و ھر چہ بودی با من بگفتی و بھر کاری کہ مرا بر راہ کردی در خلا و ملا یک سخن بودی، ھیچ وقت مرا در خلا سخن نگفتی و کاری نفرمودی در ملا عین آن نگفتی۔ یعنی ظاہر و باطن یک روش داشت و این از عجائب روزگار است۔'' (۷)

یعنی میں محرم راز خادم تھا جو بات بھی ہوتی مجھ سے فرماتے اور جس کام کے لیے بھی مجھے متعین فرماتے تو سب کے سامنے اور پیچھے ایک ہی بات فرماتے۔ کبھی بھی تخلیے میں مجھ سے کوئی ایسی بات نہیں فرمائی اور کوئی ایسا کام نہیں بتایا کہ جسے سب کے سامنے جوں کا توں مجھ سے نہ کہا ہو۔ یعنی ظاہر و باطن میں ان کی ایک روش تھی اور یہ بات عجائب روزگار میں سے ہے۔

شیخ فرید کی رواداری، فراخدلی، دردمندی اور عوام پروری نے لوگوں کے دلوں کو جوڑنے کا کام کیا۔ ایک بار ایک شخص نے شیخ فریدالدین کی خدمت میں ایک چاقو کا تحفہ پیش کیا۔ آپ نے وہ چاقو اس کو واپس کر دیا اور فرمایا کہ میرے لیے چھری مت لاؤ، سوئی لاؤ کیونکہ چھری کاٹنے یا جدا کرنے کا آلہ ہے جب کہ سوئی جوڑنے کا آلہ ہے۔(۸)

شیخ نظام الدین اولیا نے بھی اپنی خانقاہ میں بیعت کا دروازہ سب کے لیے کھول رکھا تھا۔ غیاث پور(۹) شہر سے کچھ دور تھا۔ لیکن سڑک پر آنے جانے والے لوگوں کی بھیڑ سے کسی میلے کا گمان ہوتا تھا۔ ضیاؤالدین برنی لکھتا ہے کہ صبح سے لے کر آدھی رات تک خانقاہ میں آنے جانے والوں کا ہجوم رہتا تھا۔ دن بھر لنگر چلتا تھا جہاں ہزاروں آدمی کھانا کھاتے تھے۔ شیخ کا لنگر خانہ ہندو مسلم سب کے لئے کھلا تھا۔ وہ ہندوؤں کی بھی اتنی ہی فکر کرتے تھے جتنی مسلمانوں کی۔ ان کی مذہبی رواداری مشہور ہے۔(۱۰)

ان کی خانقاہ کا لنگر غربا، مساکین اور سماج کے نادار مفلس طبقہ کے لیے باعث رحمت تھا اور لنگر میں وہ اشیا پکائی جاتی تھیں جو سب کے لیے قابل قبول ہوتیں۔ افلاس زدہ اور تنگدست لوگوں کے لیے حضرت محبوب الٰہی کے دل میں کتنا درد تھا اس کا اندازہ سیر الاولیاء میں درج اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ رمضان المبارک میں محبوب الٰہی کے خادم نے سحری میں کچھ زیادہ کھانا حضرت کے سامنے اس خیال سے رکھا کہ افطار میں بھی آپ نے کم کیا تھا۔ حضرت نے پھر تھوڑا سا کھا کر واپس کر دیا۔ اس پر خادم نے عرض کیا کہ حضرت آپ نے افطار بھی برائے نام کیا اور سحری میں بھی تھوڑا سا تناول فرمایا۔ اس سے نقاہت بڑھے گی۔ محبوب الٰہی نے فرمایا کہ دہلی میں نہ معلوم کتنے لوگ بھوکے ہوئے ہیں اور کتنوں کو پیٹ بھر کھانا نصیب ہوا ہوگا؟ میں کیسے شکم سیر کھا سکتا ہوں؟(۱۱)

انکساری اور سخاوت صوفیائے اکرام میں بدرجہ اتم موجود تھی۔ خلق خدا کی پذیرائی کے لیے صوفیاء طعام سے تواضع پر بہت زور دیتے تھے۔ حضرت محبوب الٰہی کا ارشاد گرامی ہے کہ لوگوں کو کھانا کھلانا بہت اچھی بات ہے۔(۱۲) یہ بھی ارشاد فرمایا کہ خدا کی مخلوق کو کھانا کھلانا تمام مذاہب میں پسندیدہ ہے۔(۱۳)

خانقاہوں میں ہر آنے والے کو کھانے کی کوئی چیز دی جاتی تھی۔ حضرت محبوب الٰہی فرماتے ہیں کہ شیخ بدرالدین غزنوی(۱۴) کا قاعدہ تھا کہ اگر ان کے پاس کچھ بھی نہ ہوتا تو کہتے کہ پانی ہی پیش کر دیں۔(۱۵)

کھانا کھلانے میں نیک و بد، بڑے چھوٹے، مسلم یا غیر مسلم کی کوئی تفریق پسند نہیں کی جاتی تھی۔ شیخ نظام الدین اولیا کی مجلس میں ایک بار کھانے سے متعلق گفتگو ہوئی۔ آپ نے فرمایا کہ کھانا کھلاؤ چاہے کوئی بھی ہو۔ خواہ اس کو جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں اور سلام کرو چاہے اس سے شناسائی ہو یا وہ انجان ہو۔ اور اس موقع پر آپ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ایک حکایت بیان فرمائی کہ ایک مشرک ان کا مہمان بنا۔ حضرت ابراہیم نے جب دیکھا کہ غیر ہے تو اس کو کھانا نہیں کھلایا۔ پھر آپ کے پاس فرمان (وحی) نازل ہوا کہ اے ابراہیم! ہم جان عطا کر سکتے ہیں اور تم روٹی نہیں دے سکتے۔ (۱۶)

مہمان داری صوفیائے اکرام کے اخلاق و انسان دوستی کا ایک اہم جز و تھا۔ مہمان کی خاطر اتنی عزیز تھی کہ آپ فرماتے تھے کہ ہر آنے والے کو سلام کے بعد طعام پیش کیا جائے اور اس کے بعد بات چیت کی جائے۔ خواجہ صاحب اس بات کی تلقین کرتے تھے کہ ایک بار شکم سیر ہونے کے بعد کھانا نہیں کھانا چاہیے لیکن اگر مہمان آجائیں تو ان کی خاطر دوبارہ کھانے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ (۱۷) عزیز و اقارب آجائیں تو ان کے سامنے کھانا حاضر کرنا چاہیے اور کسی سے یہ نہیں پوچھنا چاہیے کہ وہ روزے سے ہے یا نہیں۔ (۱۸)

آپ فرماتے تھے کہ دنیا کو ترک کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ایک لنگوٹہ باندھ کر بیٹھ جائے۔ ترک دنیا یہ ہے کہ لباس پہنے، کھانا کھائے۔ البتہ جو کچھ بھی اس کے پاس آئے اسے خرچ کرتا رہے۔ جمع نہ کرے، اس سے رغبت نہ رکھے اور دل کو کسی چیز میں اٹکا کر نہ رکھے۔

> ''ترک دنیا آن نیست کہ کسی خود را برھنہ کند مثلاً لنگوتہ بندد، بنشیند، ترک دنیا آن است کہ لباس بپوشد و طعام بخورد، امّا آنچہ می رسد روان می دارد و جمع نکند و با او میل نکند و خاطر را بچیزی متعلق ندارد۔ (۱۹)

شیخ خدمت خلق کو عبادت سے افضل سمجھتے تھے۔ آپ فرماتے تھے تم جو چیز اپنے لیے پسند نہیں کرتے وہ دوسروں کے لیے بھی پسند مت کرو۔ (۲۰)

جس طرح اللہ تعالیٰ ہر چیز سے بے نیاز ہو کر بندہ پر عطا و کرم کا دروازہ کھلا رکھتا ہے، اسی طرح اس کے بندوں کو بھی کرنا چاہیے۔ خواجہ معین الدین چشتی فرماتے ہیں جس شخص میں تین خصوصیات ہوں تو حقیقت میں اللہ تعالیٰ اس شخص کو پسند کرتا ہے۔ اس میں دریا جیسی سخاوت، آفتاب کی سی شفقت اور زمین کی مانند تواضع ہو۔ (۲۱) یہ ان کے افکار کا مکمل ترجمان اور چشتیہ اصولوں کا بہترین آئینہ دار ہے۔

خانقاہ میں ہر آنے والے کے ساتھ اخلاق سے پیش آنا ضروری تھا۔ بعض اوقات کوئی آنے والا اگر بد اخلاقی سے پیش آتا تو اس کے ساتھ بھی مشفقانہ اور اچھا برتاؤ کیا جاتا۔ ان کی نظر میں دوست و دشمن میں کوئی فرق نہیں تھا۔ ان کا

عقیدہ حافظ کے اس شعر سے واضح ہوتا ہے:

درخت دوستی نشان کہ کام دل بہ بار آرد نہال دشمنی برکن کہ رنج بی شمار آرد (۲۲)

یعنی دوستی کا درخت لگاؤ کیونکہ دل کا مقصد پھل لانا ہے۔ دشمنی کا پودا اکھاڑ پھینکو کیونکہ بے شمار تکالیف دیتا ہے۔

شیخ نظام الدین اولیا فرماتے ہیں کہ مشائخ کی ایک رسم ہے کہ کوئی اشراق سے پہلے عصر کی نماز کے بعد ان کے پاس نہیں جاتا لیکن میرے پاس ایسا نہیں ہے۔ آپ فرماتے تھے: ''ہر وقت کسی بیاید گو بیا''۔ (۲۳)

اس ضمن میں کئی واقعات ایسے ہیں جو مشائخ کے ان افکار کی وضاحت کرتے ہیں۔ مثلاً:

''جوالقی درآمد و لختی کلمات نافرجام گفت، چنانکہ نہ لائق مجلس ایشان باشد۔ خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر ہیچ نگفت تو قعی کہ او کرد آن را بہ وفا رسانید۔ بعد از آن روی سوی حاضران کرد و گفت کہ این معنی ہم می باید، بسیار کسان می آیند و سر بر قدم می نہند و چیزی می آرند، پس این چنین کسان نیز می باید تا بیایند و بی محابا ہر چہ باید بگویند، از این چیزہا، آن چیزہا مکفر می شود۔'' (۲۴)

(ترجمہ: ایک جوالقی (ملنگ) شیخ نظام الدین کی مجلس میں آیا اور نامناسب باتیں کرنے لگا جو اسے مجلس میں نہیں کرنی چاہیے تھیں۔ خواجہ نے کچھ نہیں کہا اور اس کی جو توقعات تھیں انہیں پورا کر کے اسے رخصت کیا۔ اس کے بعد حاضرین سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ ایسی باتیں بھی ہونی چاہئیں۔ بہت سے لوگ آتے ہیں سر قدموں میں رکھتے ہیں، نذر کرتے ہیں، اسی طرح ایسے لوگ بھی آنے چاہئیں جو بے باکی سے جو بھی چاہیں کہ ڈالیں۔)

ایک دفعہ ایک بوڑھا شخص اپنے بیٹے کے ہمراہ شیخ الاسلام فرید الدین گنج شکر کی خدمت میں آیا۔ باتوں کے درمیان لڑکے نے گستاخی کے انداز مین شیخ سے بحث کرنی شروع کی۔ اس طرح کہ اونچی آواز میں بولا۔ شیخ نے بھی آواز بلند کی۔ خواجہ نظام الدین فرماتے ہیں کہ میں اور مولانا شہاب الدین جو شیخ کے صاحبزادے تھے، ہم دونوں دروازے کے باہر بیٹھے تھے۔ جب زیادہ شور ہوا تو اندر آئے۔ وہ لڑکا بے ادبی سے گفتگو کر رہا تھا۔ مولانا شہاب نے اندر آ کر اس لڑکے کو طمانچہ مارا۔ لڑکے نے غصہ میں مولانا پر حملہ کرنا چاہا۔ شیخ نظام الدین نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اسی درمیان شیخ الاسلام نے فرمایا کہ آپس میں صلح وصفائی کر لو۔ مولانا شہاب نے ایک عمدہ کپڑے کا ٹکڑا اور کچھ نقدی باپ بیٹے کو دی۔ دونوں خوش ہو کر واپس چلے گئے۔ (۲۵)

ایک مجلس میں ایک شخص حضرت نظام الدین اولیا سے ایک مسئلہ پر نہایت سخت گفتگو کرنے لگا۔ شیخ نے اس کا جواب دیا اور وہ لاجواب ہو کر چلا گیا۔ شیخ کو پشیمانی ہوئی کہ انہوں نے ایسا جواب کیوں دیا جس سے وہ شرمندہ ہو کر چلا گیا۔ شیخ نے بعد میں فرمایا کہ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ وہ مجھ سے پشیمان ہوا۔ ایک اس واسطہ کہ کیوں اس سے وہ بات

کہی جس سے وہ ملزم بنا دوسرے چونکہ وہ مسافر تھا، مجھے چاہئیے تھا کہ اس کو کپڑا اور نقدی دیتا۔ان باتوں سے مجھے پشیمانی ہوئی۔(۲۶)

ان صوفیائے اکرام کا عقیدہ تھا کہ ہندوؤں کے ساتھ بھی شگفتہ تعلقات رکھے جائیں۔ چونکہ خانقاہوں کے دروازے بلاتفریق قوم و مذہب وملّت سب کے لئے کھلے تھے،اس لئے ان میں حاضر ہونے اور ذکر وتذکیر میں تبدیلی مذہب کی کوئی شرط نہیں تھی۔ان کا ماننا تھا:

بندۂ عشق شدی ترک نسب کن جامی کہ دراین راہ،فلاں ابن فلاں چیزی نیست

یعنی اے جامی جب تم عشق کے غلام ہوگئے تو حسب ونسب کے چکر میں مت پڑو کیونکہ اس راہ میں فلاں ابن فلاں کوئی چیز نہیں ہے۔

شیخ الاسلام فریدالدین گنج شکر کی خانقاہ میں جوگی اکثر حاضر ہوتے تھے۔دومرتبہ شیخ نظام الدین اولیا کی ان سے گفتگو ہوئی۔(۲۷) مشائخ کی وسعت نظر اور رواداری کا یہ حال تھا کہ کوئی بات پسند آتی تو اس کی بے تکلف تعریف کرتے۔ایک بار جوگی کی کسی مسئلے پر شیخ نظام الدین اولیا سے گفتگو ہوئی۔جوگی نے جس طرح اپنے خیالات کا اظہار کیا اور وضاحت کی تو شیخ نظام الدین پر بہت اثر ہوا اور فرمایا:''مرا این سخن او خوش آمد۔''(۲۸)

ہندو مذہب کی طرف مشائخ چشت کا جو رویہ تھا اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک روز صبح کے وقت شیخ نظام الدین اولیا اپنی جماعت خانہ کی چھت پر چہل قدمی فرما رہے تھے۔آپ نے دیکھا کہ پڑوس میں کچھ ہندو بتوں کی پوجا کر رہے ہیں۔شیخ نے فرمایا:''ہر قوم راست راہی دینی وقبلہ گاہی''اس وقت شیخ کے سر پر ٹوپی کچھ ترچھی تھی۔ امیر خسرو نے فوراً ہی دوسرا مصرعہ کہا:''ما قبلہ راست کردیم بر طرف کج کلاہی''۔

ایک دن شیخ نظام الدین اولیا کا ایک مرید اپنے کسی ہندو دوست کو حضرت کی خدمت میں لے کر آیا اور عرض کیا کہ یہ میرا بھائی ہے۔جب دونوں بیٹھ گئے تو خواجہ نے اس مرید سے پوچھا کہ تمہارا یہ بھائی اسلام سے بھی کچھ رغبت رکھتا ہے؟ اس نے عرض کیا کہ اسی بات کے لیے اسے یہاں لایا ہوں کہ حضرت کی نظر التفات کی برکت سے مسلمان ہو جائے۔خواجہ آبدیدہ ہوگئے اور ارشاد کیا کہ کسی کے کہنے سے یا وعظ وتقریر سے کچھ نہیں ہوتا یا دل نہیں بدلتا۔اگر کسی سچے صالح آدمی کی صحبت ملے تو امید ہوتی ہے کہ اس کی برکت سے مسلمان ہوجائے۔(۲۹) آپ نے فرمایا مشائخ کا طریقہ یہ ہے کہ جب کسی کا حال معلوم کرنا چاہتے ہیں تو پوچھتے ہیں کہ فلاں کن لوگوں میں اٹھتا بیٹھتا ہے۔اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس قبیل کا ہے۔(۳۰)

مختصر یہ کہ ہندوستانی عوام کے جذبات، خیالات وافکار کو ذہن میں رکھ کر صوفیائے اکرام نے اپنے فعل وکردار میں ان

چیزوں کو روا رکھا جن سے عام لوگ متأثر ہوں۔ انہوں نے اللہ کی وحدانیت، رسول کی عظمت، اسلام کے ارکان اور تصوف کے زرین اصولوں کے خدوخال کو سمجھتے ہوئے خود کو اس انداز میں ڈھالا اور اپنے فکر و افکار اور کردار سے عوام کو وہ روشنی عطا کی جو ان کے لیے نہ صرف قابل قبول بلکہ افتخار کا باعث بھی تھا۔ ان کی خانقاہوں نے تہذیبی یگانگت اور یکجہتی میں اہم رول ادا کیا۔ ان کے کردار اور رویہ نے لوگوں کے دلوں میں جگہ بنالی جس کی عکاسی آج بھی ان کے وصال کے بعد بھی نظر آتی ہے۔ نہ صرف مسلمان بلکہ دوسرے مذاہب کے لوگ بھی بڑی تعداد میں ان کے مزارات پر حاضری دیتے ہیں۔

﴿حواشی﴾

(۱)۔ مثنوی معنوی، جلال الدین محمد رومی، دفتر دوم، اردو ترجمہ قاضی سجاد حسین، سب رس کتاب گھر، دہلی، ۱۹۷۶ء، ص ۱۷۰
(۲)۔ یہ اشعار سعدی کی گلستان سے مأخوذ ہیں۔ گلستان سعدی، مترجم غلام عباس ماہو، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۲۰۰۴ء ص ۴۵۔ (۳)۔ دیوان حافظ، خواجہ شمس الدین محمد حافظ شیرازی، بہ اہتمام محمد قزوینی و دکتر قاسم غنی، کتابخانہ زوّار، تہران۔ ص ۵۔ (۴)۔ فوائد الفوائد، امیر حسین سجزی، بہ تصحیح عبداللطیف ملک، لاہور، ۱۹۶۶ء ص ۱۲۵۔۱۲۶
(۵)۔ ایضاً، ص ۶۔۷۔ (۶)۔ شیخ بدرالدین اسحاق حضرت شیخ فریدالدین گنج شکر کے خاد، خلیفہ اور داماد تھے۔ اپنے زمانے کے مشائخ اور زہد و فقر میں بے نظیر تھے۔ شیخ فرید کے ملفوظات پر مبنی ایک کتاب 'اسرارالاولیا' تصنیف کی۔ آپ کا مدفن اجودھن کی قدیم جامع مسجد میں ہے۔ اخبارالاخیار، شیخ عبدالحق محدّث دہلوی، مطبع مجتبائی، ۱۳۰۹ھ، ص ۶۶۔۶۷
(۷)۔ فوائد الفوائد، ص ۱۲۶۔ (۸)۔ ایضاً، ص ۳۸۴۔ (۹)۔ موجودہ بستی حضرت نظام الدین کا نام قدیم زمانے میں غیاث پور تھا۔ حضرت نظام الدین کے نام کی شہرت کی بنا پر غیاث پور بھلا دیا اور اب اسے بستی حضرت نظام الدین کہتے ہیں۔ (۱۰)۔ تاریخ فیروز شاہی، ضیاؤالدین برنی، تصحیح سید احمد خان، ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتہ ۱۸۶۲ء، ص ۳۴۵
(۱۱)۔ سیر الاولیا، سید محمد بن مبارک علوی کرمانی معروف بہ میر خورد، مرکز تحقیقات فارسی، ایران و پاکستان، انتشارات اسلامی لاہور ۱۹۷۸ء، ص ۱۳۸۔ (۱۲)۔ فوائد الفوائد، ص ۲۷۔ (۱۳)۔ ایضاً، ص ۲۸۔ (۱۴)۔ شیخ بدرالدین غزنوی خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے خلیفہ تھے۔ وعظ فرماتے تھے۔ شیخ نظام الدین بھی آپ کی مجلس میں شریک رہتے تھے۔ آپ کا مزار خواجہ قطب الدین کے مزار کے پائینتی ہے۔ اخبارالاخیار، ص ۵۰۔ (۱۵)۔ فوائد الفوائد، ص ۲۳۴۔ (۱۶)۔ ایضاً، ص ۳۴۹۔ (۱۷)۔ ایضاً، ص ۴۸۔ (۱۸)۔ ایضاً، ص ۱۸۔ (۱۹)۔ ایضاً، ص ۱۲۔۱۳۔ (۲۰)۔ سیر الاولیا، ص ۳۳۰۔ (۲۱)۔ ایضاً، ص ۵۶۔ (۲۲)۔ دیوان حافظ، ص ۸۷۔ (۲۳)۔ فوائد الفوائد، ص ۱۶۹۔ (۲۴)۔ ایضاً، ص ۸۰۔ (۲۵)۔ ایضاً، ص ۲۷۰۔۲۷۱۔ (۲۶)۔ ایضاً، ص ۲۷۰۔ (۲۷)۔ ایضاً، ص ۱۴۹ اور ۴۱۷۔ (۲۸)۔ ایضاً، ص ۱۴۴۔ (۲۹)۔ ایضاً، ص ۳۰۵۔۳۰۶۔ (۳۰)۔ ایضاً، ص ۳۶

''ققنوس'' کا تجزیاتی مطالعہ

ڈاکٹر محمد قیصر، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ فارسی، اے ایم یو، علی گڑھ

ققنوس نیما یوشیج کی شاہکار نظم ہے۔ نیما کا اصل نام اسفندیار اور والد کا نام ابراہیم خان تھا۔ قصہ رنگ پریدہ نیما کی پہلی نظم ہے جیسے اس نے ۱۳۳۹ھ میں مثنوی مولوی کے وزن پر کہا تھا۔ ''ققنوس'' نیما نے ۱۳۵۶ھ مطابق ۱۳۱۶ش میں کہا تھا۔ نیما کی شاعری میں سب سے زیادہ نمایاں اور غالب جو چیز نظر آتی ہے وہ طبیعت اور جہان ہے۔ نیما پہلا شاعر ہے جس نے طبیعت اور جہان کو اپنا موضوع اور مضمون بنایا ہے۔ نیما کی شاعری میں دوسری چیز جو ابھر کر سامنے آتی ہے وہ اجتماعی اور اقتصادی بحث ہے۔ نیما کے زیادہ تر اشعار انتقادی پیچیدگیوں سے معمور ہیں اور ہر بار معانی کو جیسا کہ وہ محسوس کرتا ہے ایک نئی شکل میں پیش کرتا ہے۔ طبیعت سے دوستی اور دلبستگی نیما کے اشعار کی خاص پہچان ہے اور یہی چیز نیما کو دوسرے شعراء سے ممتاز بناتی ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے نیما کی بیشتر زندگی گاؤں، پہاڑوں اور جنگلوں میں بسر ہوئی تھی اس کا عکس بھی اس کے اشعار میں بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ قدرتی مناظر، درختان، گیاہان، پرندگان، حیوانات اور حشرات کا ذکر بکثرت موجود ہے۔ نیما کی شاہکار نظم ''ققنوس'' بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

ققنوس، مرغ خوشخوان، آوازه ی جهان،
آواره مانده از وزش باد های سرد،
بر شاخ خیزران،
بنشسته است فرد
برگرداو به هر سر شاخی پرندگان
اونالـه های گمشده ترکیب می کند،
از رشته های پاره ی صد های دور،
درابر های مثل ختی تیره روی کوه،
دیوار یک بنای خیالی
می سازد
از آن زمان که زردی خورشید روی موج

کمرنگ ماندہ است و بہ ساحل گرفتہ اوج
با نگ شغال، ومردد ہاتی
کردہ ست روشن آتش پنہان خانہ را
قرمز بہ چشم ،شعلہ ی خردی
خط می کشد بہ زیر دو چشم درشت شب
وندر نقاط دور،
خلقند ردر عبور
او، آن نوای نادرہ، پنہان چنانکہ ہست،
از آن مکان جای گزیدہ ست می پرد
در بین چیز ہای کہ گرہ خوردہ می شود
با روشنی و تیرگی این شب دراز
می گذرد
یک شعلہ را بہ پیش
می نگرد
جای کہ نہ گیاہ در آنجاست، نہ دمی
ترکیدہ آفتاب سمج روی سنگھاش،
نہ این زمین وزندگی اش چیز دلکش اشت
حس می کند کہ آرزوی مرغہا چواو
تیرہ ست ہمچو دوداگر چند امید شان
چون خرمنی ز آتش
در چشم می نماید وصبح سفید شان
حس می کند زندگی او چنان
مرغان دیگرار بسر آید
درخواب وخورد،

رنجی بود کز آن نتوانند نام برد

نیما یوشیج نے ارزش احساس و پنج مقالۂ دیگر اور حرفہای ہمسایہ میں شعروادب سے متعلق اپنے نظریہ کو پیش کرتے ہوئے نظم کی اہمیت پر سب سے زیادہ زور دیا ہے۔ ان کا یہ نقطہ ءنظر ہے کہ ہر ادبی کلام کی تشکیل اپنی اہمیت کی محتاج ہے۔ ہیت کو احساسات وجذبات کا ایک نظام قرار دیتے ہیں جہاں ذہن میں محفوظ احساسات یادداشتیں اور دیگر تفصیلات ظاہر ہوتی ہیں۔ نیما نے اس نقطہ ءنظر کا بھی بار بار اظہار کیا ہے کہ وہ شعرءا جو قدیم شعراء کی حدوں کو عبور کر کے آگے نہیں بڑھتے ہیں وہ متحجر ہونے لگتے ہیں۔

نیما پر فرانسیسی علامات پسندوں کا بھی اثر تھا ان ہی کے زیر اثر نیما اس نقطہ ءنظر کے مؤید ہیں کے جو معنی ہیں وہی ہیت ہے اور دونوں ایک دوسرے کی تشکیل میں برابر کے حصہ دار ہیں۔

زیر مطالعہ نظم ''ققنوس'' ہیت کی ایسی تشکیل ہے جس سے اس کے معنی جنم لیتے ہیں اور ہیت کی مناسبت سے لفظ نظم میں اپنا رول ادا کرتے ہیں اور ہیت کی تشکیل میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ نظم کے آغاز میں شاعر نے ققنوس کا ذکر کیا ہے جو سرد ہواؤں کے چلنے سے در بدری میں گرفتار و مبتلا ہو گیا ہے۔

ققنوس، مرغ خوشخوان، آوازه ی جهان،
آواره مانده از وزش بادهای سرد،

اب نظم کو اسی ماحول میں آگے بڑھاتے ہیں: مثلاً ققنوس کو ''شاخ خیزان'' پر دکھایا جانا اسی ماحول کو اجاگر کر رہا ہے جس کا شروع کے دو مصرعوں میں ذکر ہے۔

''برگرداو ہر سر شاخی پرندگان'' اور ''دیوار یک بنای خیالی سے ایک دوسرا ماحول شروع ہوتا ہے۔ ''از آن زمان کہ زردی خورشید روی موج'' سے لے کر ''خلقند ردر عبور'' تک کے تمام مصرعے نہ صرف یہ کہ نظم کی بافت کو محکم کر رہے ہیں بلکہ ہیت کی تکمیل کے ساتھ ساتھ معنی کی شدت میں بھی اضافہ کر رہے ہیں۔

جای کہ نہ گیاہ در آنجاست، نہ دمی
ترکیده آفتاب سمج روی سنگهاش،
نه این زمین وزندگی اش چیز دلکش اشت
حس می کند کہ آرزوی مرغها چواو
تیره ست همچو دود اگر چند امید شان
چون خرمنی ز آتش

درچشم می نماید وصبح سفید شان
حس می کند زندگی او چنان
مرغان دیگرار بسر آید
درخواب وخورد،
رنجی بود کز آن نتوانند نام برد

تشریح: یہ وہ جگہ ہے کہ جہاں نہ گھاس ہے نہ کوئی تازگی۔ پتھر کے چٹانوں پر سورج کی شعاعیں ٹکرا کر بکھر رہی ہیں اس فضا اور زندگی میں اب کوئی دلچسپی کا سامان نہیں ہے۔ وہ پرندہ یہ محسوس کر رہا ہے کہ اگر اس کی بھی زندگی خواب وخورد میں بسر ہو تو یہ ایسا اندوہ ناک عمل ہوگا کہ جس کے نقصان کی تلافی ممکن نہ ہوگی۔ اس کی طرح دوسرے پرندوں کی بھی آرزوئیں دھوئیں کے مانند تاریکی میں لپٹی ہوئی ہیں اور مایوسی کا شکار ہے یہ الگ بات ہے کہ کچھ امیدیں آتش خرمن کے مانند آنکھوں میں چمک رہی ہیں اور تاریکی میں سپیدی کا کام کر رہی ہیں۔

''بانگی برآرد از تہ دل سوز ناک وتلخ، کہ معنیش نداند ہر مرغ رہ گذر'' تک سبھی مصرعے نظم میں ایک کلیدی مصرع کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسی طرح ''جای کہ نہ گیاہ۔۔۔ سے لے کر''۔۔۔ نتوانند نام برد'' تک نظم جس ماحول اور فضا جس کو خلق کر رہی ہے یہ مصرعے اس کا منطقی انجام ہیں۔

شروع سے آخر تک یہ نظم ایک ایسی ہیت کو جنم دیتی ہے جو معنی کو وحدت کلی میں ڈھالنے کا کام انجام دینے کے ساتھ ساتھ نظم میں ایسا ابہام بھی پیدا کرتی ہے جس سے مختلف تعبیریں جنم لیتی ہیں۔ ان ہی میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ''ققنوس'' نیما کی ذات کی علامت ہے اور ''بانگ جدید'' شعری لب ولہجہ کو قبول کرنے اور عام کرنے کے دعوت کی علامت ہے اور وہ بانگ ایسی بانگ ہے جسے عام پرندے نہیں سمجھ پا رہے ہیں۔ ققنوس (نیما کی شاعرانہ ذات) جب یہ محسوس کرتا ہے کہ فضا ناہموار ہے اور اس کی صدا کو سمجھنے والا کوئی نہیں ہے تو وہ یہی بہتر اسمجھتا ہے کہ آگ میں جل کر مر جائے تاکہ اس کی راکھ سے نئے جوجے جنم لیں۔ آگ میں جلنا اور اس کی راکھ سے جوجے کا جنم لینا قدیم شعری نظام کے انہدام کی علامت ہے۔ نئی روش کے لئے فضا کا ہموار ہونا اس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ پورانے نظام کو توڑا نہ جائے۔

شاعر نے اس صورت حال کو ققنوس کی علامت سے ایک تازگی اور انوکھے پن کے ساتھ پیش کیا ہے اور اسی میں اس کا فنی حسن پوشیدہ ہے۔ ققنوس ایک ایسا خیالی پرندہ ہے جو آگ میں جل مرتا ہے اور پھر اپنی ہی راکھ سے دوبارہ جنم لیتا ہے۔

☆☆☆☆☆

تصوف کیا ہے؟

ڈاکٹر محمد افضل، استاد احمدی اسکول، اے ایم یو، علی گڑھ

اسلام کے تین شعبے ہیں (۱) عقاید (۲) اعمال ظاہرہ (۳) اصلاح باطن خیر والقرآن میں تینوں شعبوں کی جامع شخصیات ہوا کرتی تھیں۔ مرور زمانہ کے ساتھ اسلام کا دائرہ وسیع ہوا اور مبلغین اسلام پر ذمہ داریوں کا بوجھ بڑھنے لگا اور نورانیت کا دائرہ سکڑنے لگا، جس کی وجہ سے ان تینوں شاخوں میں مستقل محنت کی ضرورت محسوس ہوئی، چنانچہ معلمین اسلام نے ہر شعبہ پر الگ الگ محنت کی، جن لوگوں نے علم عقائد پر جانفشانی کی ان کو دنیا نے متکلمین کے لقب سے یاد کیا۔ جنہوں نے اعمال ظاہرہ کے نوک و پلک سنوارے ان کو فقہاء کہا جاتا ہے۔ تیسری وہ جماعت جس نے ان دونوں علوم کے اندر اخلاص وللّٰہیت کی روح ڈالنے کا ذمہ اپنے سر لیا ان کو محسنین اور صوفیہ کے تمغہ سے سرفراز کیا گیا۔ ان کے میدان عمل کو علم الاحسان، علم الاخلاق، علم تصوف جیسے ناموں سے پہچانا گیا۔ موجودہ دور میں تصوف کی اصطلاح زبان زد عام ہے۔

تصوف کا مطلب

۱- حضرت ذوالنون مصریؒ م ۲۴۵ھ فرماتے ہیں چار باتیں تصوف کی روح ہیں، (۱) حب جلیل، اللہ سے محبت (۲) بغض قلیل، دنیا سے نفرت (۳) اتباع تنزیل قرآن کی پیروی (۴) خوف تحویل، استقامت کے بعد دوبارہ تبدیلی کا خوف۔[۱]

۲- حضرت ابولقاسم ابراہیم بن محمد نصرابادی م ۳۶۹ھ خراسان کے رہنے والے تھے، مکۃ المکرّمہ میں وفات پائی، فرماتے ہیں تصوف نام ہے، کتاب وسنت پر کاربند رہنے، خواہشات اور بدعتوں کو ترک کرنے، مشائخ کا احترام مخلوق کے اعذار قبول کرنے اوراد پر مداومت، رخصتوں اور تاویلات سے احتراز کرنے کا۔[۲]

۳- حضرت جنید بغدادی متوفی ۲۹۷ھ تصوف کی تشریح ان الفاظ میں کرتے ہیں۔ دنیا کو کمتر اور چھوٹا سمجھنے اور دل دنیاوی آلائشوں سے پاک کرنے کا نام ہے۔[۳]

تصوف کا ماحصل طاعت کے ساتھ دنیا میں رہ کر اخروی زندگی کا استحضار۔

تصوف کا ثبوت آیات قرآن سے

۱- ربنا وبعث فیھم رسولا منھم یتلواعلیھم ایتك ویعلھم الکتب والحکمة ویزکیھم۔[۴] ابراہیمؑ کی دعا، ان میں ایک رسول انہیں میں سے بھیج، اور اس کی ذمہ داری تیری آیات کو پڑھ کر سنانا اور ان کے معانی و مفاہیم کو

سکھلانا، اوران کوظاہری وباطنی گندگی سے صاف وستھرا کرنا، ویزکیھم تصوف کا منبع ومرکز ہے۔

۲- ویزکیھم کا لفظ جوعلم تصوف کواپنے اندرسموئے ہوئے ہے۔آل عمران:۱۶۴،اورسورہ جمعہ:۲، میں بھی آیا ہے۔

۳- اللہ تعالیٰ نے تصوف کے حصول کوکامیابی کا ضامن قرار دیا ہے۔قد افلح من تزکیٰ [۵] بیشک بھلا ہوااس کا جوسنورا۔

۴- ولی اللہ کا خاص مشغلہ رات کی عبادت ہے جس کے لیے یہ آیت قم اللیل الاقلیل [۶] دلیل ہے۔

۵- واذکراسم ربك وتبتل الیه تبتیلا ۔ [۷] اپنے رب کا ذکر کرتے رہواورخالق کا تعلق تمام مخلوق پرغالب رہے،اس آیات سے ارکان تصوف صراحت کے ساتھ ثابت ہورہے ہیں۔

۶- ففروالی اللہ [۸] ابوبکرورّاق اورجنید بغدادی فرماتے ہیں نفس وشیطان معاصی کی طرف دعوت دینے والے ہیں بہکانے والے ہیں۔تم ان سے بھاگ کراللہ کی طرف پناہ لوتو وہ تمہیں ان کے شر سے بچالیں گے۔[۹] یعنی اللہ کی طاعت اورذکر کی کثرت کروجوتصوف کے اعمال میں سے ہیں۔

۷- فاذا فرغت فانصب والی ربك فرغب [۱۰] یعنی جب آپ دعوت حق اورتبلیغ احکام سے فارغ ہوں تو نماز، ذکراللہ، دعا، استغفار میں لگ جائیں، یہ آیت صراحتاً تصوف کا پتہ دے رہی ہے۔

۸- الاالذین آمنو وعملوالصلحت وتواصوابالحق وتواصوبالصبر [۱۱] ،امام شافعی نے اس سورت میں چار چیزوں کی طرف اشارہ کیا ہے، اول دوایمان وعمل صالح اپنی ذات سے متعلق ہیں، اورآخر کے دوحق کی نصیحت اورصبر کی وصیت دوسرے مسلمانوں کی ہدایت واصلاح سے متعلق ہیں۔[۱۲]

۹- وزرواظاھرالاثم وباطنه ،ظاہری اور باطنی گناہ کوترک کرو، المراد بظاھر الاثم افعال الجوارح و باطنه افعال القلوب۔[۱۳]

احادیث سے تصوف کا پتہ

۱- بخاری شریف کی ایک حدیث ہے جوحدیث جبرائیلؑ کے نام سے ہے اس حدیث میں حضرت جبرئیلؑ اعرابی کی شکل میں تشریف لائے انہوں نے آپ ﷺ سے چندسوالات کیے۔ماالایمان، ماالاسلام، ماالاحسان، اس حدیث میں ماالاحسان سے مرادعلم تصوف ہے ماالاحسان کے جواب میں اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ نماز اس طرح پڑھوکہ تم خدا کو دیکھ رہے ہواگر یہ نہ ہوسکے تو اتنا تو ضرور خیال رکھوکہ خدا تم کو دیکھ رہا ہے۔[۱۴] یہی تصوف کی اصل ہے کہ خدا کی معرفت حاصل ہوجائے۔

۲- حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں، حفظت من رسول اللہ ﷺ وعائین فاما احدھما فبثثته واما

الاخرفلو بشثته قطع هذاالبلعوم۔۱۵؎

۳۔ آپ ﷺ نے فرمایا:ماصب الله فی صدری الاوقدصببته فی صدر ابوبکر۔۱۶؎
اللہ نے میرے سینہ میں جو کچھ ڈالا میں نے اسے ابوبکر کے سینہ میں منتقل کردیا۔

اجماع سے تصوف کا ثبوت

محدثین نے احادیث کی قوی اور ضعیف کے اعتبار سے مختلف قسمیں کیں ہیں سب سے قوی حدیث کی قسم متواتر ہے۔اس کی تعریف یہ ہے کہ اس کے راوی اتنی تعداد میں ہوں ان کا جھوٹ پر اتفاق محال ہو۔۱۷؎اس تعریف کے دائرہ میں علم تصوف بھی آتا ہے۔علم تصوف بھی از سلف تا خلف بتواتر رائج ہے۔

مذکورہ آیات واحادیث سے قطعی طور پر یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ تصوف دین اسلام کا ہی ایک شعبہ ہے اور اسلام کے دونوں شعبوں کو مضبوطی اور مقبولیت کی راہ ہموار کرنے میں مدومعاون ہے۔

تصوف کے حاملین نے ہر دور میں دین اسلام میں پیدا ہونے والی بدعات وخرافات کا قلع قمع کیا ہے،امت میں جب جب اخلاقی انحطاط اور ایمانی ضعف کے آثار نمودار ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں نورانی شخصیات کے ذریعہ دین اسلام کی اصلی روح کو زندہ کرایا۔

اموی حکومت میں نمو پذیر جاہلی رجحانات واثرات کے خاتمہ کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ متوفی ۱۰۱ھ کو پیدا کیا۔دوسری صدی میں اخلاقی وایمانی کمزوری کو رفع کرنے کے لیے حضرت حسن بصری متوفی ۱۱۰ھ کی صلاحیتوں کا سہارا لیا گیا،جب عباسی دور حکومت آیا تو ان کے اندر بھی دولت وحکومت نے وہ تمام خرابیاں پیدا کردیں جو بنوامیہ میں تھیں۔اس وقت بغداد میں اولیاء کی ایک جماعت سفیان ثوری ۱۶۱ھ،فضیل بن عیاض متوفی ۱۸۷ھ،جنید بغدادی،معروف کرخی متوفی ۲۰۰ھ،وغیرہ نے اسلامی روح کو لوگوں کے سامنے پیش کیا۔

فتنہ خلق قرآن نے جب سر ابھارا تو امام احمد بن حنبل متوفی ۲۴۱ھ نے جان کی بازی لگا کر اس فتنہ کا سد باب کیا، فتنہ اعتزال کے سامنے ابوالحسن اشعری متوفی ۳۲۴ھ سیسہ پلائی دیوار بن کر کھڑے ہوئے،جب یونانی فلسفہ اور باطنیت نے اسلامی دنیا کو اپنے جال میں پھنسانے کی کوشش کی تو اللہ تعالیٰ نے اس کے توڑ کے لیے امام غزالی م ۵۰۴ھ کو پیدا کیا، حب جاہ اور حب مال نے مسلمانوں میں افتراق پیدا کیا تو شیخ عبدالقادر جیلانی م ۵۶۱ھ نے توحید خالص غیر اللہ کی بے ثباتی کا درس دیا جب صلیبی حملہ وروں نے بیت المقدس کی حرمت کو پامال کیا،تو نورالدین زنگی اور صلاح الدین ایوبی م ۵۸۹ھ جیسے باصفا نفوس نے ان کے حوصلوں کو لگام دی،تاتاریوں کو حلقہ اسلام میں لانے والے اولیاءاللہ ہی تھے۔۱۸؎ذکر کردہ تمام حضرات تصوف کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز تھے،جابر وظالم حکومتیں ان کی آواز سے لرزہ براندام رہتی تھیں،سلطان جائر

کے سامنے کلمہ حق کہنے میں کبھی ان نفوس نے تاویلات کا سہارا نہ لیا جان کی بازی لگا کر دین اسلام کو سربلند کیا۔

ایک انگریز مورخ کا قول ہے کہ ہندوستان میں اسلام کی اشاعت زیادہ تر صوفیاء اور تاجروں کے ذریعہ ہوئی ہے۔۱۹

اولیاء اللہ کا وجود انسانیت کے لیے سراپا رحمت ہے ان سے دشمنی اللہ کے غضب کو دعوت دینا ہے، انحضرت ﷺ کا ارشاد ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے من عادلی ولیا فقد اذنته بالحرب۔۲۰

اولیاء اللہ اصلاح امت کے لیے مختلف طریق اپناتے ہیں طرق کا مختلف ہونا ظرف ومکان کے اعتبار سے ہوتا ہے لیکن ان طرق میں شریعت کے دائرہ میں ہی ادل بدل ہوتی ہے اور ان تمام طریقوں کا منبع شریعت ہی ہوتا ہے۔

مصلحین امت کے پاس آنے والے کو اول بیعت کے مرحلہ سے گذرنا پڑتا ہے۔

بیعت

شریعت کی کسی بات کے لیے لوگوں سے عہد لیا جائے کہ وہ اس کام کو انجام دیں گے خواہ پوری شریعت کا عہد یا کسی خاص بات کا عہد اس کو بیعت کہا جاتا ہے۔۲۱

بیعت کا مقصد: طالب اور مطلوب میں مناسبت ہم آہنگی پیدا کرنا ہے۔

آنحضرت ﷺ سے چار طرح کی بیعت کا ثبوت ملتا ہے،

۱- **بیعت جہاد**، صلح حدیبیہ کے موقع پر صحابہ سے آپ نے خون کے آخری قطرہ تک دشمن سے جنگ کرنے کی بیعت لی۔

لقد رضی الله عن المومنین اذیبا یعونك تحت الشجرة ،۲۲ اللہ تعالیٰ خوش ہوا ان مسلمانوں سے جو درخت کے نیچے آپ سے بیعت کر رہے تھے۔

۲- **بیعت اسلام**: ہجرت سے قبل حج کے ایام میں مدینہ منورہ سے آنے والے چند افراد نے اسلام قبول کیا اور کفر شرک سے بیزاری کا اظہار کیا اور شریعت مطہر پر کاربند رہنے کی آپ کے ہاتھ بیعت کی۔ جو بیعت عقبہ اولیٰ اور بیعت عقبہ ثانیہ کے نام سے معروف ہیں۔۲۳

۳- **بیعت ہجرت**: حارث بن زیادہ ساعدی فرماتے ہیں کہ میں یوم خندق میں آپ ﷺ کی خدمت حاضر ہوا آپ لوگوں سے ہجرت پر بیعت لے رہے تھے۔۲۴

۴- **بیعت توبہ**: عن عوف بن مالك الاشجعیؓ قال كناعندالنبی ﷺ تسعة او ثمانیة او سبعة فقال الاتبایعون رسول ﷺ فبسطنا ایدینا وقلنا علی مانبایعك یارسول الله قال ان تعبدو الله ولاتشركو ابه شیئا

وتصلوالصلوات الخمس وتسمعو وتطیعوا ۔۲۵ حضرت عوف بن مالک اشجعی فرماتے ہیں کہ ہم لوگ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے نو آدمی تھے یا آٹھ یا سات ارشاد فرمایا کہ تم رسول ﷺ سے بیعت نہیں کرتے ہم نے اپنے ہاتھ پھیلا دیے اور عرض کیا کہ کس امر پر آپ ﷺ سے بیعت کریں یارسول اللہ ﷺ آپ نے فرمایا ان امور پر کہ اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک مت کرو اور پانچوں نمازیں پڑھو اور احکام سنو اور مانو، یہ حدیث مشائخ میں رائج بیعت کا صریح ثبوت ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سبھی کے دلوں میں ان نفوس کی عظمت ومحبت پیدا فرمائے۔آمین

﴿حواشی﴾

(۱)-روح تصوف اردو،ص:۳۰،مولانا محمد عرفان بیگ،روح تصوف ص:۱۷،مفتی محمد شفیع صاحب۔(۲)-تصوف کا انسائیکلو پیڈیا اردو،ص:۱۲۱،امام ابوالقاسم عبدالکریم بن ھوازن القشیر ی۔(۳)-سو بڑے زاہدین،ص:۴۳۔(۴)-سوہ بقرۃ:۱۲۹۔ (۵)-سورہ اعلیٰ:۱۲۔ (۶)-سورہ مزمل:۲۔ (۷)-سورہ مزمل:۸۔(۸)-سورہ ذٰریٰت:۵۰۔ (۹)-الجامع الاحکام القرآن ، ج:۱۹،ص:۵۰۴،قرطبی۔ (۱۰)-سورہ نشرح:۷-۸۔ (۱۱)-سورہ عصر:۳۔ (۱۲)-معارف القران،ص:۲۱۸۔ (۱۳)-تفسیر خازن،ج:۲،ص۱۴۶۔ (۱۴)-بخاری،ج:۱،ص۱۲، مکتبہ رشیدیہ دہلی۔ (۱۵)-ایضاً ص:۲۳۔ (۱۶)-تصوف وسلوک،ص۲۸، شیخ ذوالفقار،(پاکستان)۔ (۱۷)-نخبۃ الفکر،ابن حجر۔ (۱۸)-مستفاد تاریخ دعوت وعزیمت،ج۱،مولانا ابوالحسن علی ندوی۔(۱۹)-مجالس حکیم الامت،ص۲۲۷،مفتی محمد شفیع۔ (۲۰)-رحمۃ اللہ والواسعۃ ص:۲۹۸،مفتی محمد سعید احمد صاحب پالنپوری۔(۲۱)-تصوف وسلوک،ص۲۳۔(۲۲)-سورہ الفتح:۱۸۔(۲۳)-تاریخ اسلام،ج:۱،ص:۱۲۵۔(۲۴)-حدیث۔(۲۵)-شریعت وتصوف،ص۱۰۴م،مولانا مسیح اللہ خاںؒ

فروغ فرخزاد اپنے معاصرین میں یکتا شاعرہ

تحسین بانو، ریسرچ اسکالر، شعبۂ عربی و فارسی، الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد

فارسی شعر و ادب میں بہت بڑے بڑے سخن گو شاعر گزرے ہیں۔ مثلاً رودکی سمرقندی، سعدی شیرازی، مولانا روم، انوری، فرخی، فردوسی وغیرہ۔ جدید فارسی شاعری میں شعراء اتنی ہی تعداد میں موجود ہیں۔ جدید فارسی شعراء میں ملک الشعراء محمّد تقی بہار، میرزادہ عشقی، ایرج مرزا، عارف قزوینی، ابوالقاسم لاہوتی، علی اکبر دہخدا، نادر نادر پور وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ جنہوں نے اپنے کلام سے فارسی شاعری کی گراں بہا خدمات انجام دیں۔ شعر میں فارسی شعراء کے ساتھ ساتھ فارسی شاعرات بھی شانہ بشانہ نظر آتی ہیں۔ چند معروف ایرانی شاعرات ہیں۔ جن میں رابعہ قزداری کو اوّلین فارسی شاعرہ ہونے کا شرف حاصل ہے۔ رابعہ رودکی کی ہمعصر بھی تھی۔ جدید فارسی شاعرات میں سیمین بہبہانی، پروین تکین با مداد حسین صبا۔ پروین اعتصامی پہلی ایرانی صاحب دیوان شاعرہ ہے۔ فروغ فرخزاد وغیرہ شاعرات کا نام لائق تحسین ہے۔ جنہوں نے اپنی آفاقی شاعری کے سبب فارسی ادبیات میں نمایا مقام حاصل کیا۔ فروغ فرخزاد اپنی دلیر اور بے باک شاعری کی وجہ سے ان شاعرات میں ممتاز ہیں۔ میں نے اپنے اس مختصر مضمون میں فروغ فرخزاد کی فارسی شاعری کے متعلق اظہار خیال کیا ہے۔

جدید فارسی شاعری میں فروغ فرخزاد ایک ایسا نا قابل فراموش نام ہے جو اپنی بے باک اور جرات مندانہ شاعری کی وجہ سے مشہور ہیں۔ کیونکہ اس سے قبل کسی بھی شاعرہ نے شاعری میں اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے لے ایسی جرّات نہیں دکھائی۔ جب ان کے شعری مجموعہ منظر عام پر آئے تو کچھ تنگ ذہن لوگ ان کے مخالف ہو گے اور انہیں اخلاق و مذہب کا سبق پڑھانے لگے۔ کیوں کہ ان کی نظروں میں ایک مشرقی عورت کا اس بے باکی کے ساتھ شاعری کرنا صحیح نہیں تھا۔ بات جو کچھ بھی ہو اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ فروغ فرخزاد جدید فارسی شاعری میں منفرد مقام رکھتی ہیں۔

فروغ کا پورا نام فروغ الزماں فرخزاد عراقی تھا۔ جو ۵ جنوری ۱۹۳۵ء میں تہران (ایران) میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد کا نام محمّد فرخزاد تھا۔ اور والدہ کا نام تو ران وزیری تھا۔ آپ کے والد فوج میں کرنل تھے۔ ۱۳ فروری ۱۹۶۷ء کو اپنی کار سے کہیں جا رہی تھیں راستہ میں ایک اسکول بس کو بچاتے ہوئے شدید زخمی ہوئیں۔ اور اسپتال پہنچنے سے قبل محض ۳۲ سال کی عمر میں انتقال کیا۔

انہوں نے ابتدائی تعلیم تہران میں حاصل کی۔ اس کے علاوہ انہیں خیّاطی و نقّاشی فن میں بھی مہارت حاصل

تھی۔ساتھ ساتھ انگریزی اور فرانسیسی دونوں زبانوں میں اچھی مہارت رکھتی تھیں شعروشاعری کی طرف ان کا رجحان فطری تھا۔اپنی قدیم شاعری کے ساتھ ساتھ انہوں نے جدید فرانسیسی ادب کا بھی گہرا مطالعہ کیا۔فروغ فرخزاد شاعرہ ہونے کے علاوہ فلم ساز معاون ھیدایت کار بھی رہی۔فروغ جب سولہ سال کی تھیں تو پرویز شاپور سے محبّت کر کے شادی کر لی۔جو کہ ایک سرکاری ملازم تھے۔لیکن یہ شادی انہیں راس نہیں آئی۔اور اپنے شوہر سے طلاق لے کر الگ رہنے لگیں۔اس شادی سے انہیں ایک بیٹا ہوا۔جس کا نام کامیار تھا۔فروغ نے اپنی **'نادان محبت'** کا ذکر کچھ یوں کیا ہے۔

دل من کودکی سبکسر بود　　خود ندانم چگونہ رامش کرد
او کہ من گفت دوستت دارم　　پس چرا زہرغم بہ جامش کرد؟'' (۱)

فروغ شاعری میں اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے لے ہر قسم کی روایتی زنجیروں کو توڑ کر آگے نکلنا جائز سمجھتی ہیں۔بہ سبب ایں وہ بے باک شعر کہہ بیٹھتی ہیں۔یہ انہی کی ہمّت اور دلیری ہے کہ انہیں شروع سے ہی شاعروں کے حلقے میں متعارف کروادیا۔فروغ کے چار شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔جن کی ترتیب یہ ہے۔فروغ کی شاعری کا سب سے پہلا مجموعہ **''اسیر''** ہے جو کہ **۱۹۵۵ء** میں منظر عام پر آیا۔'اسیر' ۴۴نظموں پر مشتمل ہے۔اس مجموعے کی چند مشہور نظمیں یوں ہیں۔نشناس، گریز و درد، پائز، نا آشنا، اندوہ، دریائی وغیرہ۔**''دیوار''** فروغ کی شاعری کا دوسرا مجموعہ ہے۔یہ **۱۹۵۶ء** میں شائع ہوا۔جس میں ۲۵نظمیں ہیں۔آرزو، نغمۂ درد، دنیائ سایہ ہا، اندوہ پرست، دیوار، قصہ ائ درشب وغیرہ۔فروغ کی شاعری کا تیسرا مجموعہ **''عصیان''** ہے۔جو **۱۹۵۸ء** میں چھپا۔اس مجموعے میں محض ۱۷نظمیں ہیں۔جس میں بعض مختصر بعض طویل ہیں۔اس مجموعے کی چند خوبصورت اور مشہور نظمیں یہ ہیں۔زندگی، پوچ، سرورزیبائ، ظلمت وغیرہ۔ 'فروغ کی شاعری کا سب سے آخری مجموعہ **'' تولد دیگر''** ہے۔جو کہ **۱۹۶۳ء** میں شائع ہوا۔یہ مجموعہ ۳۳نظموں پر مشتمل ہے'فروغ نے اپنا یہ شعری مجموعہ، ابراھم گلستان سے منسوب کیا ہے۔''(۲) اس بند کی کچھ نظمیں اور قطعات یوں ہیں۔آفتاب می شود ،تولدگر، آرزہا، بادمارا خواہد برد، درغروب ابدی، مرداب، عروسک، کوکی، گل سرخ، وہم سبز وغیرہ۔

فروغ کا ایک پانچواں مجموعہ کلام **''ایمان بیاوریم بآغاز فصل سرد''** کے نام سے شائع ہوا ہے۔(۳)

فروغ عورتوں کی سچّی ہمدرد ہیں۔وہ انہیں اپنی بہن سمجھتی ہیں۔ان سے کہتی ہیں کہ اے میری بہنو کب تک تم یہ ظلم وستم سہتی رہوگی۔اس خاموشی کو توڑ دو۔اور اپنے لے حق وآزادی کی آواز بلن کرو۔مندرجہ ذیل اشعار سے ان کے انداز بخوبی ظاھر ہوتے ہیں۔

بخواھرم

☆ خیز ازجا، بی آزادی خویش　　خواھر من ،ز چہ رو خاموشی

خیز از جای که باید زین پس
خون مردان ستمگر نوشی
☆ کن طلب حق خودای خواهر من
از کسانیکه ضعفت دارند
از کسانیکه بصد حیله و فن
گوشہ ٔ خانہ ترا بنشاند
☆ تا بکی در حرم شہوت مرد
مایۂ عشرت ولذّت بودن
تا بکی همچو کنیزی بدبخت
سر مغرور بپایش سودن
☆ تا بکی در دہ یک لقمۂ نان
صیغہ حاجی صد سالہ شدن
هووی دوم و سوم دیدن
تا بکی ظلم و ستم۔۔خواهر من
☆ باید این نالۂ خشم آلود
بیگمان نعره و فریاد شود
باید این بندگران باره کنی
تا ترا زندگی آشان شود
☆ خیزاز جای و بکن ریشۂ ظلم
راحتی بخش ، دل پر خون را
جهدکن، جهد که تغییر دهی
بهر آزادی خود قانون را (۴)

بے باک شاعرہ ہونے کے ساتھ وہ ایک ماں کا بھی دل رکھتی ہیں۔اورا پنے بچہ کولوری گا کر سلاتی ہیں۔ ''دیو شب'' میں جس انداز سے وہ لوری سناتی ہیں اس سے ان کی ممتا کی عکّاسی صاف طور پر ظاہر ہوتی ہے۔

دیوشب

☆ لای لای ، اے پسرکوچک من
دیده بربند که شب آمده است
دیده بربند که این دیو سیاه
خون بکف خنده بلب آمده است
☆ سر بدما من خسته گذار
گو ش کن بانگ قدمها لیش را
کمر نارون پیر شکست
تاکه بگذاست بر آن پالیش را
☆ آه، بگذار که بر پنجره ها
پردها را بکشم سر تا سر
با دو صد چشم پر ازآتش و خون
میکشد دمبدم از پنجره سر
☆ از شرار نفسش بود که سوخت
مرد چوپان بدل دشت خموش
وای، آرام که این زنگی مست
پشت در داده، بآوای توگوش
☆ یادم آید که چو طفلی شیطان
مادر خسته ٔ خود را آزرد
دیو شب از دل تاریکی ها
بیخبر آمد و ظفلک را برد (۵)

نوجوانی میں فرموغ سے ایک خطا سرزد ہو جاتی ہے اور محبت کر بیٹھتی ہیں۔ جسے وہ گناہ عشق سمجھ کر تسلیم بھی کرتی ہیں۔لیکن وہ اس پر شرمندہ یا افسردہ نہیں ہوتی ہیں۔ کیونکہ ان کی نظروں میں محبت اور زندگی ایک دوسرے کی تکمیل ہیں نہ کہ ضد۔ان کا اضطراب عشق ان کا دکھ درد صرف ان ہی کی ذات تک محدود نہیں ہے بلکہ وہ سب کے لے خواب دیکھتی ہیں اور سب کا خیال رکھتی ہیں۔مثال کے طور پر ان کی نظم ''رویا'' پڑھئے جس سے ان کے احساس بخوبی ظاہر ہو جائیں گے۔

باامیدے گرم وشاد بخش
بانگاہے مست ورویائی
دخترک افسانہ میخواند
نیمہ شب در کنج تنہائی
بیگمان روزی زراہ دور
میرسد شاہزادۂ مغرور
میخورد بر سنگفرش کوچہ ہائی شہر
ضربۂ سم ستور یادپیالیش
می درخشد دشولۂ خورشید
برفراز تاج زیبالیش
تار و پود جامہ اش از زر
سینہ اش پنہان بہ زیر رشتہ ہا از دُر و گوہر
میکشاند ہر زمان ہمراہ خود سوئے
باد پر ہائے کلاہش
یابر آن پیشانئ روشن
حلقۂ موئ سیماہش را''(۶)

فروغ کی اکثر نظمیں بے چینی اور بے قراری کی ترجمانی کرتی ہیں۔ان کی نظموں میں مستی، حسرت، تلخی، گناہ، ہوس، ترس و ہراس، زہر غم، سکوت شب، سایہ ہا وغیرہ مخصوص الفاظ ملتے ہیں۔مثلاً۔مرداب، اندوہ تنہائی، خدا، عصیان، زندگی، وہم سبز، دیدار در شب، گمشدہ، دنیائ سایہ ہا، درغروبی ابدی، آرزو، نغمہ درد، خانۂ متروک، پائز، دیدار تلخ تمام ایسی نظمیں ہیں جس میں ان کی بے چینی و بے قراری صاف طور پر دیکھائی پڑتی ہے۔

''کبھی ایسا لگتا ہے وہ اپنے گرد وپیش سے، اپنی زندگی سے، ہر چیز سے بیزار ہو اور ایک ابدی سکون کی آرزومند، بہار زندگی سے زیادہ اسے خزاں عزیز ہے کہ کہتی ہے: ؎

کاش چون پائز بودم کاش چون پائز خاموش وملال انگیز بودم
برگھای آرزویم یکہ زرد میشد آفتاب دیدگانم سرد میشد (۷)

اگرچہ فروغ کا عشق حقیقی نہ ہو کر عشق مجازی ہے۔ جو اپنے اظہار کے راستہ میں آنے والی ہر طرح کی بندشوں اور رکاوٹوں کو حائل نہیں ہونے دیتا ہے۔ اس سبب ان کی شاعری تاثرات کے اعتبار سے بہت اثر انداز نہیں ہوتی ہے پھر بھی ان کی شاعری ایک ایسا فنکارانہ شعور پایا جاتا ہے جو ان کے ہر عیب کو چھپا لیتا ہے۔ جدید فارسی شاعری میں فروغ فرخزاد وہ واحد شاعرہ ہیں جنہوں نے صرف ۳۲ کی عمر پائی اور اس کم عمر میں ہی انہوں نے وہ شہرت، عزت اور کامیابی پائی جو زندہ جاوید ہے۔

﴿منابع وماخذ﴾

(۱) ایران میں جدید فارسی ادب کے پچاس سال۔ داکٹر رضیہ اکبر حیدرآباد۔ اگست ۱۹۹۱ء، صفحہ نمبر۔ ۲۷۷
(۲) ایضاً۔ صفحہ نمبر۔ ۲۹۲
(۳) مجلّہ پیک جوانان، دورہ ۸، شمارہ ۱۲۔ بحوالہ۔ عصری فارسی شاعری اور شعراء۔ ڈاکٹر سیّد احسن الظفر۔ نامی پرس لکھنؤ۔ دسمبر ۱۹۸۹ء۔ صفحہ نمبر۔ ۴۵۸
(۴) تذکرہ شعرای معاصر ایران۔ جلد دوم۔ سیّد عبدالحمید خلخالی۔ تہران، ایران۔ ۱۹۵۸ء۔ صفحہ نمبر۔ ۲۵۰
(۵) برگزیدہ شعر فارسی معاصر۔ جلد دوم۔ دکتر منیب الرحمٰن۔ ادارۂ علوم اسلامیہ۔ دانش گاہ اسلامی۔ علیگرہ۔ ۱۹۶۳ء۔ صفحہ نمبر۔ ۱۷۷
(۶) ایران میں جدید فارسی ادب کے پچاس سال۔ ڈاکٹر رضیہ اکبر۔ حیدرآباد۔ اگست ۱۹۹۱ء۔ صفحہ نمبر۔ ۲۸۰، ۲۸۱
(۷) ایضاً۔ صفحہ نمبر۔ ۲۸۳

فارسی ادب کی ایک ہشت پہلو شخصیت: مہاراجہ رتن سنگھ زخمی

ناظر حسین، ریسرچ اسکالر، شعبۂ فارسی لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ

دلّی کی مرکزیت ختم ہونے کے بعد ہندوستان میں جو مختلف دیسی ریاستیں معرض وجود میں آئیں ان میں اودھ کا اہم مقام ہے۔ علم وفضل، تہذیب وشائستگی، ادب وثقافت کے شعبوں میں اس ریاست کے حکمرانوں اور باشندوں کے خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ اودھ کے حکمراں چونکہ فارسی کے عاشق زار تھے۔ اس لئے اس زبان کی ترویج واشاعت میں انہوں نے گہری دلچسپی دکھائی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک قلیل مدت میں لکھنؤ فارسی کے مرکز کے طور پر معروف ہوگیا۔ سطور ذیل میں لکھنؤ کی کثیر الجہات شخصیت کا تعارف مقصود ہے۔ جسے ہم رتن سنگ زخمی کے نام سے جانتے ہیں۔ مہاراجہ رتن سنگھ زخمی ایک قادرالکلام شاعر، صاحب طرز ادیب، نکتہ شناس شارح، مستند ومعتبر تذکرہ نویس اور ماہر علم نجوم تھے۔

ان کا پورا نام رتن سنگھ زخمی تھا۔ زخمی کے دادا راجہ بگھوان داس وزیر المما لک آصف الدولہ (۱۲۲۵ء تا ۱۲۹۲ء) کے اتالیق تھے انہیں بریلی کی نظامت سپرد کی گئی تھی [۱] والد کا نام بالک رام تھا۔ مہاراجہ جھاؤمل کے نائب تھے۔ فارسی کے عمدہ شاعر تھے اور صبوری تخلص اختیار کیا تھا۔ زخمی کے والد بالک رام نواب آصف الدولہ کے دور میں افسر توپ خانہ تھے ان کی شہرت اور اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ لکھنؤ کا توپ خانہ ''بالک گنج'' جو شہر کے مغربی حصہ میں واقع تھا اب اس وقت ''بالا گنج'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ انہیں کے نام سے موسوم تھا [۲]

رتن سنگھ زخمی کی ولادت ۲۳ رمحرم ۱۱۹۷ھ مطابق ۹ ردسمبر ۱۷۸۲ء کو یکشنبہ کی رات لکھنؤ میں ہوئی۔ ان کا آبائی وطن بریلی تھا اپنے آبائی مذہب میں رہتے ہوئے عربی، فارسی، ترکی، سنسکرت اور کسی قدر انگریزی زبان کے ساتھ ہیت اور انشاء کی مہارت حاصل کی [۳]۔ فارسی تذکرہ نویسی کے مصنف اس کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے۔

> ''زخمی در لکھنؤ در شب یکشنبہ ۲۳ رمحرم سنہ ۱۱۹۷ھ مطابق ۹ ردسامبر ۱۷۸۲ء میلادی چشم بدنیا کشود و در آغاز شباب شوق اکتساب علم بدلش افتاد بنابریں بعضی زبانہای مشہور ومتداولی مانند فارسی وعربی وہندی وسنسکرت وانگلیسی را بقدر مایحتاج فراگرفت وباعلوم عقلیہ ونقلیہ دراین زبانہا آشنا شد'' [۴]

لیکن تذکرۂ ریاض العارفین کے مطابق زخمیؔ کے سال ولادت میں فرق ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

> ''زخمی راجہ رتن سنگھ صاحب بہادر لکھنوی ابن رائے بالک رام ابن راجہ بھگوان داس

بہادر پدر خسرم کہ ولادتش درسن یک ہزار و یکصد رنود ہجری است'' ۵

سید سلمان ندوی رسالہ ''معارف'' میں لکھتے ہیں۔

''منشی الملوک فخر الدولہ دبیر الملک رتن سنگھ زخمی جائے پیدائش لکھنؤ قوم کائستھ اس کا خاندان تین پشت سے دربار اودھ میں معزز عہدوں پر ممتاز تھا۔ رتن سنگھ بڑا فاضل تھا۔ اور علامہ تھا۔ اس کے اصلی کمالات فلسفہ کے زیر عنوان ظاہر ہوں گے۔ اس کا دادا بھگوان داس آصف الدولہ کا ایام شاہزادگی میں اتالیق تھا اور عہد حکومت میں دیوان تھا۔ رتن سنگھ نے منجملہ اور تصانیف کے سلطان التواریخ نام کتاب شاہان اودھ کی تاریخ میں لکھی ۱۲۵۸ھ میں ساٹھ سال کی عمر میں یہ کتاب اس نے ختم کی'' ۶

صبح گلشن کے مولف سید علی حسن خاں زخمی کے سلسلہ میں یوں تحریر کرتے ہیں۔

''زخمیٔ مہاراجہ رتن سنگھ بہادر کہ از شاہان اودھ بخطاب فخر الدولہ دبیر الملک، مہاراجہ رتن سنگھ بہادر ہوشیار جنگ سرفراز بود اصلش از رام پور است پدرش بالک رام در سرکار وزیر الممالک نواب آصف الدولہ بہادر والی ملک اودھ عہدۂ میر آتش را انصرام میخود و توپ خانہ بالک گنج در لکھنؤ بنامش الی الآن مشہور و زخمی در عہد نمازی الدین حیدر اولین بادشاہ دار السلطنت لکھنؤ و ثمرۃ الخلافۃ نصیر الدین حیدر بادشاہ دومی بخطاب و خدمت منشی الملوک مخاطب و مامور بود، و در زمانہ محمد علی شاہ سومین لکھنؤ بمنصب دیوانی آں ریاست و خطاب مہاراجگی کلاہ گوشہ بآسمان سود و پایان کار دار سنہ یک ہزار و دوصد و شصت و چہار دین اسلام را ملت حقہ یافتہ اختیار نمود و بعد سہ سال در ۱۲۶۷ ہجری راہ آخرت پیمود با اکثر علوم عربی و فارسی و ترکی و انگریزی و سنسکرت آشنائی داشت و پیسرش کنور دولت سنگھ شکری تخلص کہ در غفوان جوان مرد از پدر والا قدر قدم فراتری گذاشت'' ۷

زخمیٔ ابتدا میں نصیر الدین حیدر (۱۸۲۷ء تا ۱۸۳۷ء) کے اتالیق مقرر ہوئے اس کے بعد داروغگی کا عہدہ پر فائز ہوئے۔ نواب غازی الدین حیدر کے دربار سے منشی الملک کا خطاب ملا اور اس کے دیوان کے میر منشی بنائے گئے۔ محمد علی شاہ تک زخمی اسی عہدہ پر فائز رہے۔ محمد علی شاہ نے انہیں فخر والدولہ دبیر الملک مہاراجہ رتن سنگھ بہادر ہوشیار جنگ کے خطاب سے نوازا۔

''زخمی در عہد غازی الدین حیدر اولین بادشاہ در السلطنت لکھنؤ و ثمرہ الخلافۃ نصیر الدین حیدر بادشاہ دومی بخطاب و خدمت منشی الملوک مخاطب و مامور بود۔ و در زمانہ محمد علی شاہ سومین لکھنؤ

بمنصب دیوانی آں ریاست وخطاب مہاراجگی کلاہ گوشہ بآسمان سود'' ۸

ادبی ذوق کے ساتھ ساتھ زخمی کو سیاحت کا بھی شوق تھا انہوں نے ہندوستان کے مختلف مقامات کا سفر کیا۔

''زخمی سیر و سیاحت اکثر بلاد ہندوستان پرداختہ ونخستین مسافرت وی از لکھنؤ بہ بریلی وطن آبائی وی بود سپس در ۱۲۱۸ھ بہ کلکتہ رفت و آنجا چند سال در خدمت ایست انڈیا کمپنی بود- بالآخرہ در ۱۲۳۰ھ بہ لکھنؤ مراجعت نمودہ در خدمت شاہ اودھ آمد'' ۹

۱۲۶۳ھ میں رتن سنگھ زخمی نے اسلام قبول کرلیا مشرف بہ اسلام اور تین سال بعد یعنی ۱۲۶۷ھ میں ان کا انتقال ہوگیا۔

درسال ۱۲۶۳ھ زخمی مسلمان شد وبعداز سہ سال در ۱۸۵۰ تا ۱۸۵۱ فوت کرد

رتن سنگھ زخمی فارسی ادب کے قادرالکلام شاعر تھے۔ زخمی کا دیوان لکھنؤ کے مشہور معروف پریس مطبع محمدی سے ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۳۲ء طبع ہوا تھا جس کے دو نسخے آج بھی خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری میں محفوظ ہیں دونوں نسخوں کے کٹیلاگ نمبر بالترتیب HL-۱۵۳۷ اور HL۱۵۳۸ میں ان کا سائز ۱۴ X ۲۴ ہے۔ دوسرے نسخہ کے سرورق پر راجہ رتن سنگھ زخمی کی دیدہ زیب تصویر شائع کی گئی ہے۔ اور آخر میں سات صفحوں پر مشتمل پروف ریڈنگ کی غلطیوں کی تصحیح منسلک ہے۔ باقی دونوں نسخوں میں بڑی مماثلت اور مطابقت پائی جاتی ہے۔ بظاہر کوئی فرق نہیں ہے۔ دیوان کے آخر میں درج ذیل فارسی عبارت لکھی ہوئی ہے۔

''دیوان فصاحت عنوان حکیم دوراں، افلاطون رماں فخرالدولہ دبیرالملک راجہ رتن سنگھ بہادر ہوشیار جنگ زخمی تخلصاً ولکھنوی متوالداً و بریلوی مسکناً اشعار ابدارش گوہر راجہ آب غلطا بندہ وموزونی مصاریع برجستہ اش وزن شعراء راہم پلہ میزان آسمان گردانیدہ بتاریخ یازدہم جمادی الآخر ۱۲۵۳ھ در دارالسلطنت لکھنؤ بمطبع سنگین محمدی باہتمام حاجی حرمین بنظر نظارگیان خردمند جلوہ گر گردیدہ وقبای طبع در برآراستہ مطبوع طبائع دقیقہ سنجان دشوار پسندہ شدہ اللہم اجعل۔ آخر ثناوآخرہ خیراً من الاولیٰ'' ۱۰

محفوظ دیوان کی ضخامت بہت زیادہ ہے جس میں کل پانچ سو تیرہ ۵۱۳ صفحات ہیں۔ اس میں غزل، رباعی، مخمس، مسدس، اور منقبت سے متعلق تمام اصناف پر اشعار ہیں البتہ زیادہ تر حصہ صنف غزل پر مشتمل ہے جس کی تفصیل سے آپ اندازہ کرسکتے ہیں۔

ای غازہ زنام تو برخ شاہد فن را پیرایہ زوصف تو عروسان سخن را

ازدست تو کافر عجمی نیست کہ درحشر
صد بار زغم پیش خدا چاک کفن را

تادل شدہ آوارہ دران زلف پریشان
رشک ست بشام سفرم صبح وطن را

زاں بادہ کزو مستی منصور تراود
ساقی قدحی لطف کن ایں تشنہ دھن را

میسند مرا ایںہمہ چوں فاختہ نالاں
ای از تو سرفرازی تو سروچمن را

بخشدا گرم جاں دم بسمل عجمی نیست
آبی است دگر خنجر آں عہد شکن را

رحمی مگرت چشم سفید ست کہ دادی
نسبت بکف پای کسی برگ سمن را ۱۱

رحمی کے شعر سرمایہ کی مقدار سر تعداد

اصناف	تعداد	تعداد الشعار
غزل	۱۰۱۸	۶۶۱۴
منقبت	۷	۷۸
مخمس	۵	۴۰
مسدس	۶۹	۴۱۴
رباعیات	۳۷	۳۷
		کل اشعار ۷۱۸۳

رحمی نے غزل کے علاوہ رباعی اور مخمس بھی لکھی ہے

درماندہ ام وہم نفس نیست مرا
می نالم وفریاد رسی نیست مرا

یاب بنظر بحال زارم از رم
جز مسلم وجز تو کسی نیست مرا

کسی خواب وخورش وکو چشم وای کردن
من وہر شب زدرد دل بکویش نالہا کردن

شودتازہ درراہ معشوق روزی جان فدا کردن
چہ باشد عاشقی خود رابغمہا مبتلا کردن

بصدخون جگر بیگانہ ای را آشنا کردن

گرفتم جان من جا کرد از بیداد اوبرلب
کشیدم صد جفا ہر روز دیدن صد بلا ہر شب

بصد تقریب کردم پیش او اظہار بر مطلب
چہ حاصل زینہمہ افسانہ مہر و وفا یارب

کہ نتواں دردل بی مہراو یک ذرہ جاں کردن

عجب نبود گر باینہمہ بیرحمی جاناں کند زخمی خدا در راہ او جان و دل وایمان
ہمیں بودست طرز عاشقاں کشتہ ہجراں فغانی کمتریں بازیست درعشق مگو ادیاں

جفااز بیوفا دیدن ونامش راوفا کردن ۱۲

موج گنگ کے مصنف لکھتے ہے کہ زخمی فارسی کے علاوہ اردو میں بھی شعر کہا کرتے تھے ۱۳
فارسی کلام زیادہ تر کہتے تھے کبھی کبھی اردو میں طبع ازمائی کر لیتے تھے۔

آنسوؤں سے ہوئی سرسبز میری کشت مراد ابر کیا چیز ہے اور بارش باراں کیا ہے
جذ تیرے در کے یہ سب ہیچ ہیں جاؤں میں کہاں بزم زیاد ہے کیا محفل رنداں کیا ہے

جیسا کہ ذکر آچکا ہے رتن سنگھ زخمی اودھ کے ایک معروف فارسی نثر نگار تھے ان کی ایک کتاب ''حدایق النجوم'' علم ہیت پر ہے جس میں ۱۵۶ اجزا اور ۲۵۹ لوائح ہیں تعداد صفحات گیارہ سو انٹھاون ۱۱۵۸ ہیں ۲۵ ذی قعدیٰ ۱۲۵۶ ہجری ۱۹ جنوری ۱۸۴۱ء مطبع محمدی لکھنؤ سے شائع ہوئی۔

۱۲۵۳ھ اودھ کے نواب محمد علی شاہ کی فرمائش پر لکھی۔ جس کے نقشہ جات اور جدولیں زخمی نے خود ترتیب دی ہے یہ اس فن کی بہترین کتابوں میں شمار کی جاتی ہے حدایق النجوم کے صفحہ نمبر ۲ پر یہ شعر موجود ہے۔

فرزانہ خدائی بنن پرور در داد رسی یگانہ داور
بینائی بخش چشم بینش پیدا کن جملہ آفرینش
عقل ارچہ بجستجو فروشد حیران در کہنہ ذات اوشد
رازش کس نکشتہ پیدا راز ہمہ کس برو ہو یدا ۱۴

''شرح گل کشتی'' دور صفوی کے معروف شاعر ابوالعال نجات اصفہانی کی مثنوی ''گل کشتی'' کی شرح ہے۔ مہاراجہ رتن سنگھ زخمی نے نجات اصفہانی کے اشعار کی تشریح کی ہے نجات اصفہانی کی مثنوی کے تعداد اشعار ۴۹۱ ہے۔ زخمی نے تشریح اشعار کے درمیان، سعدی، وحشی، نظامی، فغانی، ظہوری، انوری وغیرہ جیسے شعراء کے کلام کو نمونے کے طور پر لکھا ہے۔

کتاب کی عبارت تحقیقاناً ہے مگر سادہ اور سلیس زبان کا استعمال کیا گیا ہے۔

ذیل کی عبارت سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

''حل مشکلات ہمچو کہ کتاب لانخل یعنی مثنوی میر ابوالعال نجات اصفہانی کہ موسوم بہ گل کشتی است افتادہ ام وبا ایں چنیں بیزبانی در بیان غوامض ایں نکات ایں کتاب دقیق منزلتہ الاقدام نکتہ سنجان برسر دیاراست لب کشادہ ام عجیب نیست کہ لغزش بکار بود یا خطای واقع شود ۱۵''

''شرح گلِ کشتی''، زخمی اپنے بیٹے کنور دولت سنگھ شکری کے درس وتدریس کے دور سان آسان اصطلاحات کے ساتھ ۱۲۵۸ھجری میں ترتیب دیا مقدار صفحات ۹۶ اور مقدار اشعار ۲۹۱ ہیں ''شرح گلِ کشتی'' کے صفحہ نمبر ۹۶ پر یہ کلام درج ہے۔

دل بیتاب من امروز کند فریادی　　آہ از مطلب من کز نمایدیادی[۱۶]

زخمی انیس العاشقین کے نام سے فارسی شعراء کا ایک تذکرہ بھی ترتیب دیا انہوں نے یہ تذکرہ ۱۲۴۵ھ میں مکمل کیا اس میں تقریباً ۲۰۰۰ مقدمین اور متاخرین شعراء کا ذکر ہے شعراء کے احوال اختصار کے ساتھ درج ہیں۔

اشعار کے انتخاب میں غزل اور رباعی پر زیادہ توجہ مبذول کی ہے

تاریخ کے اعتبار سے بھی زخمی کی اہمیت کچھ کم نہیں ہے تاریخ میں ان کی کتاب ''سلطان التواریخ'' کے نام سے فارسی ادب میں مشہور ہے جو اودھ کی تاریخ ہے، اس میں اودھ کے نواب خاندان کے ابتدا سے نواب محمد علی شاہ کے وفات تک کے حالات قلم بند ہیں۔

اس کے علاوہ ''معیار الزماں'' اور ''جام گیتی نما'' ان کی اہم تصنیفات ہیں اس طرح رتن سنگھ زخمی نے فارسی ادب کے مختلف میدانوں میں اپنی صلاحیت کا مظاہر کیا ہے فارسی شاعری میں ایک نمایاں حیثیت حاصل کی علم نجوم میں خاص مہارت کا مظاہرہ کیا زخمی کی شرح وتعبیر کے میدان میں ایک خاص اہمیت ہے اپنے تذکرہ کے ذریعے ہمیں تمام شاعروں کے احوال وآثار اور ان کے کلام سے متعارف کرا کے قابل تحسین کارنامے انجام دئے جس کی علمی وادبی دنیا میں یقیناً پذیرائی ہونی چاہئے۔

﴿حواشی﴾

(۱) نقوی، علی رضاء سید ''تذکرہ نویسی فارسی در ہندو پاکستان'' ص ۵۲۱-۵۲۶۔ (۲) خان سید علی حسن ''صبح گلشن'' ص ۱۹۸-۱۹۰۔ (۳) معارف اعظم گڑھ جلد-۳، ص ۲۳۱ ماہ صفر ۱۳۴۷ھ۔ (۴) نقوی، علی رضاء سید! ''تذکرہ نویسی فارسی در ہندو پاکستان'' ص ۵۲۱-۵۲۶۔ (۵) آفتاب رائے لکھنوی ''تذکرہ ریاض العارفین'' ص ۸-۹۔ (۶) ''معارف'' نمبر-۲، جلد-۳، ص ۶۳-۶۴ جولائی ۱۹۱۸ء رمضان ۱۳۳۶ھ۔ (۷) سید علی حسن ''صبح گلشن'' ص ۱۸۹-۱۹۰۔ (۸) ایضاً

(۹) (۱) نقوی، علی رضاء سید ''تذکرہ نویسی فارسی در ہندو پاکستان'' ۔ (۱۰) مہاراجہ رتن سنگھ زخمی، ''دیوان زخمی''، مطبع محمدی ۱۲۵۳ لکھنؤ۔ (۱۱) راجہ رتن سنگھ زخمی، ''دیوان زخمی'' دیوان کی پہلی غزل، مطبع محمدی ۱۲۵۳ لکھنؤ۔ (۱۲) زہرہ فاروقی ''اودھ کے فارسی گوشعراء'' ص ۱۸۲-۱۸۳۔ (۱۳) ''موج گنگ'' از بدھ پرکاش گپتا ص ۱۸۵۔ (۱۴) ''حدائق النجوم'' از زخمی ص-۲، ۱۲۵۶ھ مطبع محمدی لکھنؤ۔ (۱۵) ''شرح گلِ کشتی'' ص ۲-۳۔ (۱۶) ''شرح گلِ کشتی'' از خمی ص-۹۶، ۱۲۵۸ھ مطبع محمدی لکھنؤ

میراث خطی

دبیر کے اس شمارے میں اس کالم کے معمول کے مطابق کے ایک یا ایک سے زاید کتابوں کے خطی نسخوں کا تعارف پیش کیا جاتا ہے اس مرتبہ افضل الطرایق اور تشریح الحروف کا تعارف پیش کیا جارہا ہے۔ (مدیر)

افضل الطرایق کے ایک قلمی نسخے کا مختصر تعارف

پروفیسر عزیز عباس، شعبہ اردو و فارسی، گورونانک دیو یونیورسٹی، امرتسر
محمد الطاف بت، ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو و فارسی، گرونانک دیو یونیورسٹی، امرتسر

حمد گویم آن خدای پاک را کو مکرم ساخت مشت خاک را [تحفۃ القراء]

تمہید؛ سرزمین کشمیر علم و ادب اور فن کے حوالے سے کافی ممتاز رہی ہے اور ہر فن میں یہاں کے فنکاروں نے اپنی یاد گاریں چھوڑی ہیں۔ خطوطی میں یہاں کے کاتبوں کا کمال وسط ایشیا کے فنکارون کے ہم پلہ ہے اور افضل الطرایق کے ایک مخطوط جس کو کاتب نے خط شکستہ میں تحریر کیا ہے کا میں یہاں اجمالاً تعارف کرانا چاہتا ہوں۔

اس سے قبل کہ ہم بالواسطہ افضل الطرایق پر بات کریں مناسب سمجھتا ہوں کہ پہلے اس رسالے کے مولّف کا مختصراً تعارف کرایں۔

تعارف:۔ حضرت شیخ احمد تارہ بلی حضرت شیخ احمد نعیم کے فرزند ارجمند ۱۲۰۱ھ مین تارہ بل میں تارہ بل میں پیدا ہوے۔ آپ کا شمار سکھ دور کے عظیم علما اور شعرا میں ہوتا ہے۔ ابتدئ تعلیم مروجہ طریقے پر ہی حاصل کی اور عربی اور فارسی زبان سے آشنائ حاصل کرنے کے علاوہ عظیم استاروں سے کسب فیض کیا جن میں قاضی جمال الدین اور شیخ عبدالقادری خاص طور پر قابل زکر ہیں۔ ایام طفولیت سے گزر کر آپ نے مروجہ سلاسلِ تصوف کی تعلیمات سے بھی آگاہی حاصل کی اور خاص طور پر شیخ اکبر ہادی سے سلسلۂ اربعہ کی تربیت حاصل کی اور کافی شہرت و مقبولیت حاصل کی۔ آپ نے اس قدر شہرت و مقبولیت حاصل کی کہ کشمیر کے علاوہ غیر کشمیری بھی آپ سے کسب فیض حاصل کرتے تھے۔ آپ کی شہرت دیکھ کر مورخ حسن یوں رقمطراز ہیں:

''کشمیر کے لوگوں کی بات تو الگ بلکہ ترکستان، ہندوستان، خراستان اور دوسرے مما لک کے لوگ

بھی انکی زیارت کو آتے تھے اور ان سے روحانی تعلیم و تربیت پا کر ہی دم لیتے تھے گویا انہوں نے ظاہری علوم کے ساتھ باطنی علوم میں بھی اعلٰی مرتبہ حاصل کیا تھا''۔

آپ نے تصوف اور سلوک میں اکبر ہادی کی پیروی کی تھی اور انکے وفات کے بعد سجادہ نشین بھی ہو گئے۔

شیخ احمد تارہ بلی ایک صوفی بزرگ تھے مریدوں کی تعلیم و تربیت کے علاوہ کتابت اور تحریر کا کام بھی کرتے تھے۔ آپ کی کئی تصانیف کا پتہ چلتا ہے جن میں افضل الطرایق کو تصوف کے میدان میں خاصی اہمیت حاصل ہے۔ چونکہ آپ نے عین جوانی میں ہی قرآن مقدس کو ازبر کیا تھا اور مختلف قرأت سے آشنائی حاصل کی تھی۔ اسی وجہ سے آپ نے ''ملُحقات ہدۃ القرأ'' بھی منظوم تصنیف تالیف کی جو دراصل محمد اسحٰق قاری جو شیخ ہمزہ مخدومؒ کے خلیفے تھے کی کتاب ہدتہ القرء پر مبنی ہے جو انہوں نے مختلف قرأت کے بارے میں منظوم کتاب تصنیف کی تھی۔ اسکے علاوہ مختلف کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے کئی اور رسالے لکھے ہیں جن میں رسالہ احمدیہ، اخباریہ، اشرافیہ المعروف اور تکملیہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

بالآخر ساری عمر تحقیق و تجسس اا ور مریدوں کی تربیت میں بسر کی۔

موضوع:۔ جہاں افضل الطرایق کے کئی نسخے محکمہ تحقیق ریاست جموں و کشمیر علامہ اقبال لائبریری میں محفوظ ہیں وہی میں نے زیر نمبر ۱۳۱ والے نسخے کا انتخاب کر کے اسکا تعارف پیش کرنا اپنا بنیادی موضوع بنایا ہے۔ یہ نسخہ مکمل ہے اور ابتدائی صفحہ پر چار لوگوں نے خط شکستہ اور خط نسخ میں تارہ بلی کا تاریخ وفات وغیرہ منظوم و منثور میں تحریر کیا ہے۔ اسکے بعد کتاب کا آغاز اس عبارت سے کیا ہے جو مقدمہ سے شروع ہوتا ہے:۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

''لا اِلٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ۔ الحمد اللہ الزی ھد ینا لہٰزا وما کنا لنہتدی لولا ان ھد ینا اللہ لقد جاء ت رسل ربنا بالحق صلوات اللہ وسلام علیھم اجمعین خصوصاً علیٰ خاتمہم اشرف عباد اللہ المخلصین والزمو اکبرھم شانا واطہرھم سلطانا۔ شعر

ومن مولا یتہٗ الکبرٰی المعتبر	و من مولٰنعم العظمٰی المغتنم
وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وارثی وآدابہ	وعلی اولیا وامتہٖ وعلی تابعی شریعتہٖ''

اس کے بعد مولانا محمد اشرف کے زہد و تقویٰ اور افضل الطرایق پر خامہ فرسائی کی اور ان کے کمال اور سلوک کے راستے اور چلنے پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے۔ سلسلہ نقشبندیہ، سلسلہ قادریہ، سلسلہ سہرودیہ اور دوسرے سلاسل جو انہوں نے حاصل کئے تھے کو مع سند پیش کر کے ان حضرات کا بھی نام لیا ہے جن کے توسط سے ان سلسل کی تعلیم و تلقین بابا اشرف تک پہنچی ہے جسے کئی دوسرے شخصیات کا بھی اجمالاً تعارف ہو جاتا ہے۔

اس کتاب کے مطالعے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مصنف کو اہل سنت والجماعت کے ساتھ دلی لگاؤ تھا کیونکہ بار بار انکے اعتقادات اور اصول پر بحث کی ہے جس کا علم ہمیں نسخہ کے صفحہ سات پر یوں اخز ہوا ہے۔

''مشایخ کرام در اصول معتقدات قلبی وفروغ معاملای بدنی و مالی و جانی تابع علم وعلماء عظایم اہل سنت و جماعت اند۔ کنز ہم اللہ وکرمہم عبادت اللہ امجاہدہ فی سبیل اللہ باران توشہ ہر یکی راروشن است۔''

کتاب کے مطالعے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ شیخ احمد تارہ بلی کٹر سنی مسلمان تھے چنانچہ سنی مسلمان بننے کی دعوت اور اس پر اعتقادات کا اظہار اپنے الفاظوں میں یون کرتے ہیں:۔

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔
الحمد اللہ الرب العٰلمین وصلوٰۃ والسلام علیٰ رسولہ محمد وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ اجمعین۔ کمل مسلمانی ومسلمان کامل آن است کہ تصحیح عقاید بموجب مذہب اہل سنت و جماعت و استقامت ورزد وتوبہ نصوح از گناھان کبیرہ وصغیرہ و امتثال نماید۔ اوامر الٰہی راازاتیان فرایض وو واجبات وسن الکل ھلال و راستی در قعال ومجتنب شود از مناہی۔''

شیخ احمد تارہ بلی خود صالح عمل کرتے تھے اور صحیح تربیت کرتے تھے یہی وجہ ہے کہ ان کی کتاب کا مطالعہ کرنے سے عقاید کی درستی اور اصلاح کی وضاحت ہوتی ہے۔ شیخ صاحب فارسی زبان وادب کے علاوہ عربی زبان سے بھی واقف تھا اور یہی وجہ ہے کہ جابجا عربی عبارات کا مطالعہ کرنا پڑھتا ہے احادیث کے علاوہ قرآنی آیات کی وضاحت نظر آجاتی ہے۔ اس کے بعد کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ موئف نے عقاید اور تواریخ کا بھی گہرا مطالعہ کیا ہے اور مختلف سلاسل کی تعلیمات کا حوالہ بار بار دیکر صحیح مسلمان بننے اور بہترین طرایق کو اپنانے کی بات کی ہے۔ گویا انہوں نے مسلمانوں کو اولیاءاللہ کا اعتقاد رکھنے کی تاکید کی ہے اور انکے محبت کو لازمی قرار دیا ہے۔ موئف نے احادیث اور آیاتِ قرآنی کو جابجا من وعن استعمال کیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ وضاحت بھی کی ہے۔ علاوہ ازیں مختلف لطایف واقوالِ بزرگان کو صحیح اور غلط بھی قرار دیا ہے۔ نسخے کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ نسخہ خط شکستہ میں لکھا ہوا ہے اگر چہ کہ کتابت موئف کے وفات کے بعد ہوئی ہے لیکن کاتب خط شکستہ کے اصول وقوانین کا پابند تھا اور خط شکستہ سے کتاب کو مزین کیا ہے اگر چہ کہ کاتب کا نام معلوم نہیں ہو پاتا لیکن نسخے کے آخر پر کاتب نے یہ تاریخ لکھی ہے کہ نسخہ ۱۳۰۶ھ میں مکمل ہوا ہے۔ الغرض شیخ احمد تارہ بلی نے اصل میں یہ نسخہ ۱۲۶۲ھ میں تصنیف کیا ہے چنانچہ رسالے کا سال تصنیف ''افضل الطرایق'' سے اخز کیا ہے جو ۱۲۶۲ کے برابر ہے۔ اسکے علاوہ اس شعر سے بھی کتاب کی تاریخ تکمیل واضح ہو جاتی ہے؛ شعر ملاحظ ہو۔

صد شکر یافت اتمام این اشرف الطرایق چون نام وسال ختمش از افضل الطرایق

چونکہ تصوف اور عرفان سے متعلق مسائل کو سمجھنا ایک مشکل اور پیچیدہ کام ہے اسلیے مصنف نے ان مسائل کی توضیح کے لیے عام فہم زبان استعمال کی ہے۔ البتہ اس کی عبارت سجع اور مرصع ہوتے ہوئے بھی دلچسپ ہے۔ جملے طولانی ہونے کی وجہ سے پڑنے والے کو دقتوں کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ فارسی عبارت میں بازاوقات زیادہ سنجیدگی اور رنگینی و چاشنی پیدا کرنے کے لیے مصنف نے فارسی اشعاروں کا بکثرت استعمال کیا ہے جس سے اصل عبارت کی احسن وضاحت ہوتی ہے۔ چند اشعار ملاحظ ہوں؛

خویش را چون درخت موسیٰ دان کآید از وی کلام حق بہ عیان
مارا ز ذات وفعل وصفت ہیچ بہنر نیست جز آنکہ تو بصورت ما آمدی بیرون
ہر نقش کہ بر تخت ہستی پیداست آن صورت آنکس است کہ آن نقش آراست
دریای کہن چو برزند موجی نو موجش خوانند و درحقیقت دریاست

خاتمہ:۔ بالآخر مولف نے ۱۲ رجب ۱۲۷۸ھ میں اس دار فانی سے رخصت ہوگئے۔ آپ کے جسد خاکی کو آپکے زادگاہ یعنی تارہ بل میں سپرد خاک کیا گیا۔ مورخ حسن نے آپکی تاریخ وفات یون رقم کی ہے۔

شیخ احمد حافظ قرآن و فخر عارفان سیزدہ روز از رجب رفیہ زد درجنان
بہر تاریخ و صال و عمرو میلادش سروش دوش در گوشم بگفتا بشنوای تاریخ دان
شیخ احمد کبروی میلاد و عمرش عا بداست شیخ احمد قادری سال و صال او بخوان

﴿حواشی﴾

۱ افضل الطرایق۔ از شیخ احمد تارہ بلی مخطوط ۔ زیر شمارہ ۴۲/۳۱ کتب خانہ مخطوطات کشمیر یونیورسٹی۔
۲ ملحقات تحفۃ القراء از شیخ احمد تارہ بلی مخطوط زیر شمار ۶۴۱ کتب خانہ مخطوطات کشمیر یونیورسٹی۔
۳ تاریخ حسن از کھویہامی جلد ۴ جلد سوم مطبوعہ ۱۹۶۱ سرینگر
۴ تاریخ کشمیر جلد اول و دوم۔ محی الدین مسکین ” ” نمبر ۱۷۱۷۔۲۰۴۸
۵ تاریخ کشمیر از سید علی
۶ تزکرہ اُولیاء کشمیر ترجمہ غلام حسن کھویہامی
۷ وجیزۃ التواریخ غلام نبی خانیاری ” ” ” ۵۳۲
۸ کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ۔ عبدالقادر سروری۔ کتب خانہ محکمہ واشاعت علامہ اقبالؒ لائبریری سرینگر۔ نمبر؛ ۱۵۲۷۲

تشریح الحروف: ایک تعارف

محمد قمر عالم، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

تشریح الحروف جس کے مصنف میر حسین دوست سنبھلی ہیں دستور زبان فارسی سے متعلق ایک غیر معروف تصنیف ہے جو کہ اب تک فارسی ادب کے قارئین کی توجہ کی محتاج رہی ہے، پیش نظر مقالہ میں ایک اہم و پر ارزش موضوع یعنی قواعد فارسی سے متعلق اس اہم و نادر تصنیف کا تعارف اس کے قلمی نسخوں کے حوالے سے منظر عام پر لانے کی سعی کی جا رہی ہے۔ دستور زبان فارسی سے متعلق فارسی زبان میں متعدد تصانیف منظر عام پر آ چکی ہیں لیکن میر حسین نے اپنی اس تصنیف کو دیگر تصانیف سے الگ کرنے کے لئے دستور زبان کے ساتھ ساتھ صنائع و بدائع، لفظی و معنوی، عروض و قوافی وغیرہ کی تفصیل بھی وضاحت کے ساتھ پیش کی ہے۔ میر حسین ایک باکمال شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ قواعد فارسی، صنائع و بدائع، عروض و قوافی، ہنر و معما میں یکتائے روزگار شمار کئے جاتے تھے اپنی ان ہی تمام تر صلاحیتوں کو یکجا کر کے انہوں نے تشریح الحروف کی شکل میں پیش کیا۔

میر حسین دوست کی جائے پیدائش قدیم تاریخی شہر سنبھل ہے۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۹ برس کی عمر میں کسب علم کے لئے دہلی جا بسے جہاں پر اس وقت ایک سے بڑھ کر ایک ادباء، شعراء اور علماء موجود تھے۔ جن کی صحبتوں سے میر حسین نے خوب استفادہ کیا، کئی سال تک شیخ فضل اللہ قدس سرہ کی صحبت میں رہ کر درس و تدریس میں مبتلا رہے۔ دہلی میں طویل عرصہ تک قیام کیا اور کاملان فن و اساتذۂ سخن سے استفادہ کر کے فن شعر گوئی میں مہارت حاصل کی۔ انہوں نے بھاکا (اردو) شاعری میں میر غلام نبی غلام عابدی سے استفادہ کیا۔ دہلی میں احمد شاہ ابدالی کے حملے کے بعد جب ہر طرف افراتفری کا ماحول پیدا ہوا تو ایک انقلاب برپا ہو گیا۔ ایسے میں میر حسین نے دہلی کی سکونت ترک کر کے بریلی کی جانب رخ کیا اور یہیں پر ۱۲۰۳ھ میں اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔

میر حسین نے فارسی ادب میں کئی تصانیف اپنی یادگار چھوڑی ہیں جن میں سے سب سے مشہور ان کا تذکرہ شعرائے فارسی بنام ''تذکرہ حسینی'' فارسی ادب کے اہم تذکروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ میر حسین نے ''تیمور نامہ ہاتفی'' نام سے بھی ایک کتاب بمقام بریلی پیش کی تھی جس کا کئی اہم تذکرہ نگاروں نے ذکر کیا ہے مگر افسوس اس کی کوئی کاپی دستیاب نہیں ہے۔ ان کے علاوہ ''تشریح الحروف'' بنام دیگر ''تشریح نادر'' جس کا تعارف اس مقالے میں کیا جا رہا ہے میر حسین کا اہم ادبی کارنامہ ہے جو کہ ابھی تک طباعت کے زیور سے آراستہ نہیں ہو سکا ہے، ''تشریح الحروف'' کے کئی قلمی نسخے دستیاب

ہیں۔ دو نسخے رامپور رضا لائبریری، ایک نسخہ شوکت پبلک لائبریری رامپور اور دو نسخے مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ میں موجود ہیں۔ پیش نظر مقالے میں مولانا آزاد لائبریری میں موجودہ نسخے کے حوالے سے تشریح الحروف کا تعارف پیش کیا جا رہا ہے:

شمارہ کتاب:۔ حبیب گنج کلکشن نمبر ۵۵/ ۱۱۵

سال تصنیف:۔ ۱۱۷۳ھ/۱۷۵۹ میلادی

سال کتابت:۔ ۱۲۳۷ھ/۱۸۲۱ میلادی

تعداد اوراق:۔ ۱۱۷

سطر:۔ ۱۵

کیفیت:۔ مکمل، خط نستعلیق

تشریح الحروف ایک مقدمہ، متعدد ابواب اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے۔ نسخہ کا آغاز خدای عزوجل کی مدحت وثنا سے ہوتا ہے اس کے بعد الفاظ اور حروف کے مرکبات کو متصوفانہ انداز میں بڑے سلیقے کے ساتھ بیان کیا ہے، نسخہ کا آغاز یوں ہوتا ہے:۔

''سپاس بی قیاس مصنفی را کہ نسخہ مفردات حروف از تصنیفات قدرت کاملۂ اوست و ثنائی بی منتہا مولفی را کہ رسالہ مرکبات الفاظ از تالیفات صنعت شاملہ او، ہر حرفی را بہ اتصال لطی بہ معنی خاص مختص گردانیدہ و ہر لفظی را بہ الحاق حرفی بر کرسی مقصدی مخصوص مربع نشانیدہ۔۔۔''

میر حسین حمد وثنا اور تشریح الحروف کی وجہ تالیف بیان کرنے کے بعد مقدمہ میں کلمہ اور کلام کی توضیح وتشریح میں اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہیں۔ کلمہ کی تعریف کرتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں:

''کلمہ لفظی است کہ معنی مفرد بالوضع داشتہ باشد و آن بر سہ قسم است، اسم، فعل و حرف۔ اگر بی تعلق زمانی بمعنی خود مستقبل است اسم است مثلاً شاہ و ماہ و روی و راہ و نشیب و فراز۔۔۔''

مولف نے بڑی حسن وخوبی اور آسان طریقے سے کلمہ کی تعریف کی ہے، اس کے اقسام کو وضاحت کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ اسم، فعل اور ان کی اقسام، حرف اور اس کی قسمیں مع مثال درج کی ہیں۔ ساتھ ہی فارسی کے استاد شعراء کے کلام جا بجا بطور نمونہ پیش کر کے کتاب کی ادبی اہمیت اور اس کے محاسن میں حد درجہ اضافہ کیا ہے۔ میر حسین نے اپنی بات کی وضاحت میں فارسی کے جن استاد شعراء کے کلام کو برائے کار لائے ہیں ان میں ابوسعدی ابی الخیر، سعدی شیرازی، مولانا جامی، حافظ شیرازی، عرفی، نظیری، فیضی، ناصر سرہندی، صائب تبریزی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

کلمہ کی تعریف وتشریح کے بعد کلام کی توضیح میں تفصیلی بحث پیش کرتے ہیں۔کلام کی تعریف اس کی قسمیں مع مثال پیش کی ہیں،اس کے بعد حروف کی تعریف،ان کی حرکات وسکنات کو بیان کیا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ تشدید، مدبر، جزم وغیرہ کی توضیح وتشریح بھی رقم کی گئی ہے۔مقدمہ لکھنے کے بعد میر حسین نے تشریح الحروف کے اصل موضوع کا آغاز کرنے سے قبل اس کی تصنیف کا مقصد نہایت سلیقے سے بیان کیا ہے۔کہتے ہیں، میں نے جو حروف اور الفاظ سے متعلق اطاعات رقم کی ہیں یہ ایک اہم کارنامہ ہے جو کہ تمام طالبان علم وفضل کے لئے بیحد کارآمد ثابت ہوگا۔اس تصنیف میں جو اطلاعات درج کی گئی ہیں وہ فارسی کی مختلف کتابوں کو یکجا کر کے شامل کی گئی ہیں تا کہ علم عروض، بحر، معما قواعد فارسی کے خواہش مند طلباء کو ایک ہی کتاب کے ذریعہ سے تمام اطلاعات حاصل ہوسکیں۔میر حسین شائقین ادب اور فارسی ادب کے طالب علموں سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس ''تشریح الحروف'' سے استفادہ کریں اور مصنف کے حق میں دعا کریں:

''مسؤل از حضرت صانع برحق و مامول از جناب علیم مطلق آنست کہ این رسالہ ندرت نگار تا قیام دور دوار مقبول و منظور سخنوران روزگار ومطلوب ومرغوب نکتہ سنجان ہر دیار گردد و راقم السطور بہ دعائی خیر ارباب سیر بادوشاد۔۔۔''

مقدمہ کے بعد ''تشریح الحروف'' کا اصل آغاز الفاظ کی تشریح سے ہوتا ہے میر حسین نے الف سے لے کری تک تمام حروف کی توضیح وتشریح کی ہے ہر الفاظ کی مختلف قسمیں اور ان کے استعمال کا طریقہ بڑے سلیقے سے اور نہایت آسان انداز میں پیش کیا ہے۔الف کی مثال کے لئے انھوں نے اپنا ہی شعر درج کیا ہے:

شاہا نظر بروئی تو کردن عبادت است　　　مژگان بہ ہم زدن چونماز جماعت است

مرکب الفاظ کی بناوٹ ان کی تشریح اور اشعار میں استعمال اپنی تمام ادیبانہ صلاحیتوں کے ساتھ پیش کیا ہے اس کے بعد صنائع لفظی ومعنوی کی تصریح وتشریح میں میر حسین نے سب سے پہلے تجنیسات لفظی کی تعریف مع اقسام جن میں اول تجنیس تام، تجنیس خطی، تجنیس ناقص، تجنیس مرکب، زایدلاحق، تنافق، مطرب، مشترک اور تجنیس مردوج کی تعریف مع مثال درج کی ہیں۔بعدازیں دیگر صنائع لفظی مثلاً استقاق، اعادرالفظ، مقلوب قلب مستوری، قلب موصل، مضمون العین، ترصیع، تلمیح، متعدلا وایل، سقویٰ، رقطا، خیفا، نقوط وغیرہ کی تعریف وتشریح بیان کی ہے۔صنعت تلمیع کی تعریف میں میر حسین یوں رقم طراز ہیں:

''تلمیع وآن چنان است کہ یک مصراع شعر عربی باشد و یکی فارسی خواجہ حافظ گوید:

الا یا ایھا الساقی ادرکا ساًوّ ناولھا　　　کہ عشق آساں نمود اول ولی افتاد مشکلھا

صنایع لفظی ومعنوی کی توضیح وتشریح کے بعد میر حسین نے کلام سے متعلق تفصیلی گفتگو کی ہے۔کہتے ہیں کہ کلام کی

دو قسمیں ہوتی ہیں ایک نثر اور دوسری نظم ،نثر کی تین قسمیں ہوتی ہیں اول جس میں قافیہ ہو نثر مسجع ،دوسری نثر مرجز یعنی وزن رکھتی ہو مگر بے قافیہ اس کے علاوہ جو ہو وہ عاری ہے۔نظم کی دس قسمیں ہیں غزل ،قصیدہ ،قطعہ ، رباعی ،فرد ،مثنوی ،مسمط ، مستزاد ،ترجیع بند وترکیب بند۔اس باب میں میر حسین نے تمام اصناف نظم کی مکمل تعریف مع مثال درج کی ہے۔

کلام کی تصریع وتشریح کے علم عروض سے متعلق نہایت اہم اور کارآمد اطلاعات مع مثال پیش کی گئی ہیں۔سبب ، وتد ، فاصلہ کی تعریف کے ساتھ معنی اور پھر مثال درج کرتے ہیں۔بحور کے ارکان اصل کو شجرہ بنا کر پیش کیا ہے اس کے بعد اسلوب اور انداز تحریر پر خاصہ گفتگو کی ہے اسلوب کی تزئین سے متعلق یوں رقم طراز ہیں:

''تزئین وآن دوازدہ نوع است اول تحریک وآن عبارت است از متحرک کردن حرفی یا بیشتر بہ حرکت مطلوبہ در عمل تحریک فتحہ بہ اسم حسین حسن از میر حسین شفیعی:

صحیفہ کہ نوادر بہار و بیرونش شگوفہ است وغم عندلیب مضمونش

تشریح الحروف کے خاتمے میں میر حسین نے اسم اور اس کی قسمیں ،فعل اور اس کی قسمیں مثلاً فعل لازم ،فعل تعدی اور فعل مرکب کی توضیح وتشریح مع مثال پیش کی ہیں۔اس کے بعد مفعول اور اس کی قسمیں مثلاً مفعول مطلق ،مفعول بہ ،مفعول لہ ،مفعول معہ ،اور فیہ کی تعریف کرنے کے بعد اضافت کی توضیح وتشریح کی گئی ہے۔اضافت کی آٹھ قسمیں بیان کرتے ہیں مثلاً اضافت تملیکی ،تخصیصی ،توصیفی ،تشبیہی ،ممازی ،ظرفی اور مبینی کو مع مثال پیش کیا ہے۔آخر میں میر حسین اپنی اس تصنیف ''تشریح الحروف'' کو رقم کرنے کے لئے خود کی کارکردگی کی تعریف کرتے ہوئے اپنی اس کاوش کو بہت اہم اور کارآمد ثبت کرتے ہیں اور ادب پرور لوگوں سے اس پر خصوصی توجہات کی گزارش کرتے ہیں۔

دکنیات

''دبیر'' کے اس مسلسل کالم میں ہمیشہ دکن کے خطہ میں ہوئی فارسی زبان وادب کے خدمات سے متعلق مضامین شائع ہوتے رہے ہیں، اس مرتبہ عظیم مثنوی نگار فردوسی ہند عصامی کی شاعری پر مقالہ نذر قائین ہے۔

فردوسیٔ دکن: عصامی کی رزمیہ شاعری

پروفیسر عزیز بانو، صدر شعبہ فارسی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

دکن کے عظیم فارسی شعراء میں فتوح السلاطین کے مصنف عصامی کا نام سرفہرست آتا ہے، جس نے آٹھویں صدی ہجری کے نصف اول میں زندگی بسر کی اور دکن کی بہمنیہ سلطنت کے بانی سلطان علاء الدین حسن بہمن شاہ کے دربار سے وابستہ رہا۔ عبدالملک عصامی دہلی کے مقام پر ۷۱۱ھ میں پیدا ہوا، والد کے نام کا پتہ نہیں چلتا، غالباً اس کے بچپن ہی میں فوت ہو چکا ہوگا اور اس نے اپنے دادا عزالدین سپہ سالار سلطان بلبن کے زیر نگرانی پرورش پائی، طبقہ امراء سے تعلق رکھنے کی وجہ سے اس نے اعلیٰ معیاری تعلیم وتربیت حاصل کی، علمی وادبی تحصیلات کے ذریعہ اپنی شخصیت وکردار کو سنوارا۔ حضرت نظام الدین اولیاء کا مرید تھا اور ان کے آستانہ سے روحانی فیض حاصل کیا۔ کمسنی ہی سے شعر کہنے شروع کئے اور بہت جلد وہ ایک باصلاحیت صاحبِ دیوان شاعر کی حیثیت سے شہر دہلی کی علمی فضا میں پہچانا جانے لگا۔ ۷۲۷ھ میں جب عصامی نے اپنے معمر دادا کے ساتھ دہلی سے دکن کیلئے کوچ کیا تو اس وقت وہ ابھی سولہ سترہ برس کا پرجوش اور جذباتی نوجوان تھا۔ اس کی پرگوئی کی مثال اس بات سے بھی ملتی ہے کہ عمر کے اس عرصہ تک وہ اپنے فارسی اشعار کے دو دیوان مرتب کر چکا تھا۔ سلطان محمد بن تغلق کا دارالخلافہ کے تبادلہ کا فیصلہ یوں تو سیاسی، ثقافتی اور سلطنت کے نظم ونسق کے اعتبار سے ہندوستان کی تاریخ کا ایک ناقابل فراموش واقعہ ہے، جس نے سرزمین دکن کی تقدیر بدل ڈالی، اس کے علاوہ اس تاریخی وقوعہ نے شاعر عصامی کی ذاتی زندگی میں بھی بڑے انقلابات بپا کئے۔

عصامی کو اپنے وطن عزیز دہلی سے بڑی شیفتگی اور محبت تھی، شہر دہلی سے اس کی دوری اسے بہت مغموم رکھتی تھی۔ اس نے اپنی مثنوی میں موقع بہ موقع دہلی سے متعلق اپنے لطیف جذبات کا اظہار کیا ہے۔ دہلی کی شان وشوکت، اس کی پرعظمت اور پرشکوہ روایات، اس کی بے مثال عمارات وبازار اور اس کی آبادی کو یاد کرتا ہے اور کہتا ہے کہ دہلی کی نظیر سارے جہاں میں نہیں مل سکتی۔

چناں تخت گاہی کہ در روزگار نماند از شہانِ جہانِ یادگار
ملائک ہمہ کوچہا لیش مدام ازپرہای خود رُفتہ ہر صبح و شام

اور پھر سلطان محمد بن تغلق کے حکم سے تبادلہ کی وجہ سے دہلی کی بربادی وویرانی سے متعلق اپنے غم وغصہ کو یوں ظاہر کیا ہے۔

غرض چونکہ شد شہر دہلی خراب بہشتِ بریں گشتہ دارالعذاب

دکن میں آمد کے بعد عصامی نے دولت آباد میں سکونت اختیار کرلی اور چالیس برس کی عمر تک مستقل طور پر یہیں قیام کیا۔اس طویل عرصہ میں اس نے یہاں امیران صدہ کی سلطان دہلی کے خلاف کشمکش اور سیاسی بغاوتوں کے ایک سلسلہ کا مشاہدہ کیا۔ان ہی دنوں قاضی بہاءالدین نے جو بہمنی دربار کے حاجب قصہ تھے،عصامی کو بلوا بھیجا، وہ ایک بڑے ادب پرور اور علم وفضل کے قدردان تھے۔انہوں نے عصامی کا کلام سنا، بہت متاثر ہوئے اور اسے شاہی دربار میں متعارف کروایا۔عصامی نے نمو کروایا۔عصامی نے نمونے کے طور پر سلطانِ دکن علاءالدین حسن بہمن شاہ کی مدح میں ایک قصیدہ پیش کیا، جس میں اس نے یہ خواہش ظاہر کی کہ شاہنامۂ فردوسی کی طرز میں وہ سلاطین ہند کا شاہنامہ قلمبند کرنا چاہتا ہے۔اگر شاہی تعاون اس کے شامل حال رہا تو اس کی یہ تصنیف ہر خاص وعام کیلئے قابل قبول ہوگی اور شاہان ہند کے ساتھ ساتھ اس کا اپنا نام بھی زندہ جاوید ہوجائے گا۔

متاع گرانمایہ دارم بسی بیارم برون تا نجوید کسی
اگر لطف شہ دست گیرد مرا بمدّاحیِ خود پذیرد مرا

اور جس طرح آج محمود غزنوی کے نام کے ساتھ فردوسی کا نام تابندہ ہے۔

جہاں تا کے باقی است اندر جہاں بہ شہنامہ باقی است نامِ شہاں

اسی طرح اس کا شاہنامہ بھی شاہانِ ہند کو حیات نو عطا کردے گا۔

زتاریخِ شاہان ہندوستان نگارم یکی نامہ چوں بوستان
موشح بطغرای شاہش کنم بہر کشور آنگاہ راہش کنم
چواین نامہ گردد بنامت تمام شود منتشر در ہمہ خاص و عام
کشاید فقاعی بنامت جہان بہ غزنین برندش ز ہندوستان

سلطان علاءالدین حسن بہمن شاہ نے بڑے فراخدلانہ انداز میں عصامی کی توقیر اور قدر ومنزلت کی اور اسے ہندوستان کے سلاطین کا شاہنامہ تصنیف کرنے پر مامور کیا۔عصامی نے اپنے جمع کردہ تاریخی مواد کے ذخیرے سے مفید اطلاعات کو یکجا کیا اور اپنے قلم کی جادو بیانی اور زورطبع کی سحر آفرینی سے شعروسخن اور تاریخ نگاری کا ایک گلستان تخلیق کیا۔

عصامی نے اپنے اس عظیم الشان شاہکار کو سلطان علاء الدین حسن بہمن شاہ کے نام معنون کیا۔

ز تاریخ شاہانِ ہندوستان نگارم یکے نامہ چون بوستان

بنیادی طور پر عصامی کا شاہنامہ ''فتوح السلاطین'' ایک رزمیہ تصنیف ہے، جس میں عصامی نے ہندوستان کے عہد وسطیٰ کے پندرہ سے زائد سلاطین کی فوج کشی، فتوحات اور تسخیر ممالک کا حال نظم کیا ہے۔ اس لئے اس کتاب میں جنگ، شجاعت، بہادری، قتل وخون کے واقعات، صف آرائی کے اصول، لشکر کشی اور حملہ آوری کے قواعد وضوابط، ہتھیاروں کا بیان اور دیگر اطلاعات دستیاب ہیں۔ شاعر جنگ اور محاذ آرائی کی اس مہارت کے ساتھ تفصیلات پیش کرتا ہے گویا وہ خود بھی ایک سپہ سالار کی طرح فنون جنگ سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس واقفیت کی بنیادی وجہ عصامی کا خاندانی پس منظر بھی ہے چنانچہ اس کے آباء واجداد سلاطین دہلی کی خدمت میں سپہ سالار، وزیر، وکیلدر جیسے اعلیٰ منصب اور عہدوں پر فائز رہے تھے اور کئی جنگوں کا تجربہ رکھتے تھے۔ سلطان غیاث الدین بلبن کے سپہ سالار عزالدین عصامی، شاعر عصامی کے دادا تھے، جن کی سرپرستی میں شاعر نے پرورش پائی۔ یقیناً وہ عصامی کیلئے میدان کارزار کے مختلف مراحل، صف آرائی کے مختلف پہلو، لشکر کشی کے مختلف انداز اور نبرد آزمائی کی گوناگوں کیفیات اور جنگ سے متعلق اطلاعات بہم پہنچانے میں اہم ذریعہ رہے ہوں۔ مزید برآں عصامی نے اپنی رزمیہ شاعری میں ذاتی مشاہدے، باریک بینی اور دقیق النظری سے استفادہ کیا ہے اور اپنے کلام میں میدان جنگ اور لشکر کی صف بندی کا بیان اس تفصیل کے ساتھ پیش کرتا ہے کہ میدان رزم کی جیتی جاگتی تصویریں قاری کی نظر میں پھر جاتی ہیں۔

عصامی کو دیگر معاصر مورخین میں اس بات پر بھی فوقیت حاصل ہے کہ اس نے میدان جنگ کی کامیاب مرقع کشی میں فوجی ٹکنیک سے بخوبی واقفیت کا اظہار کیا ہے۔ وہ نہ صرف لڑائی کی تفصیلات بیان کرتا جاتا ہے بلکہ جنگ کے دوران مختلف موقعوں پر سپاہیوں کی نفسیاتی حالت کا بھی بڑی خوبی سے تجزیہ کرتا ہے۔ اس تجزیہ کو پیش کرتے ہوئے عصامی داخلی اور خارجی مظاہر کی چھوٹی سی چھوٹی بات پر نظر رکھتا ہے اور اپنے تخیل کی بلند پروازی اور قدرت کلام کے ذریعہ جنگی تفصیلات میں معنویت اور تازگی پیدا کرتا ہے اور شعر کی لطافت ونزاکت میں کوئی فرق نہیں آتا۔

شاہنامۂ عصامی سے چند رزمیہ مناظر:

یہاں نمونے کے طور پر عصامی کی رزمیہ شاعری کی جھلک پیش کرتے ہیں۔

صف بندی کی تفصیلات:

جنگ کے واقعات کے بیان میں عصامی جنگ کی تیاریوں اور صف آرائی کے اہتمام سے ابتداء کرتا ہے۔ اور صف بندی کی روشن تصویر پیش کرتا ہے۔ معزالدین محمد بن سام غوری کی قیادت میں جب ترک افواج ترائن پہنچی اور ہندو

لشکر بھی رای پتھورا (اجمیر کا راجپوت راجہ پرتھوی راج چوہان) کی سرکردگی میں اس کے معاون ہندو سردار گوبند کے ساتھ ترک افواج کے مدِ مقابل صف آراء ہوا۔ فوجوں کی صف آرائی کا بیان بہت پرزور ہے۔

☆ رائے پتھورا اپنی فوج کے قلب میں ہاتھی پر سوار ہے، اس کے آگے ہاتھیوں کی صف تعینات ہے، صف مقدّم میں دوسرا ہندو راجہ گوبند متعین ہے، اور دائیں بائیں کی صفوں میں ہندوستانی سپاہیوں کی افواج ہیں۔

صفِ ترک چون در ترائین رسید — دو لشکر پر خاش خنجر کشید
رزآن سوئی آن ہندو آن دلیر — نکردند درساز پیکار دیر
پتھورا شدہ پشت پیلے سوار — گرفتہ بقلب سپہ خود قرار
بہ پیشش ستادہ یکے فوج پیل — خروشاں وجو شان تراز رودِ نیل

جب کہ ترک افواج تیز رفتار گھوڑوں پر سوار نبرد آزمائی کیلئے تیار ہیں۔

وزان جانب افواجِ ترکان تمام — نشستہ بر اسپان گیتی خرام
چپ وراستِ لشکر سرانِ سپاہ — قراری گرفتہ بفرمانِ شاہ

☆ سلطان فیروز شاہ خلجی کے دورِ حکومت میں مغل افواج نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ تب ہندوستانی لشکر اُن کے مدمقابل صف آراء ہوا۔ دونوں افواج پُر جوش انداز میں ایک دوسرے کی جانب دیکھ رہے تھے اور حملہ کے لئے تیار صف آراء ہو گئے۔

وزین سوی افواج ہندوستان — ہمہ ضبط کردہ رکاب و عنان
رخ آورد سوئے سوارِ مغل — ندیدہ گہے کار زار مغل
دو لشکر تماشا کنان یکدگر — ہمہ بر بناگوش بستہ سپر
خروشان دو لشکر بپا خاستند — زہر سوی صفہا بیاراستند
کمربستہ ہریک بہ پیکار چست — ستادہ برآئین روز نخست

☆ مغل حملہ آوروں کے خلاف سلطان علاء الدین خلجی کی صف آرائی:

بقلب سپہ خود سپہ کامگار — چو شیران بہ بیشتہ گرفتہ قرار
ظفر خانِ یل را بفرمود شاہ — کہ باشد سوی دست راست سپاہ
سوی دست ِچپ خان نصرت لقب — چہ فرسنگ کردہ زمین را ادب
الغخان بہ پشتیِ آن کینہ خواہ — خروشان ستادہ بہ فرمان شاہ

حملہ آوری کے انداز:

صف آرائی کی تفصیلات کے بیان کے بعد عصامی حملہ کے انداز کو بڑے ہی پر جوش اور مؤثر پیرایہ میں پیش کرتا ہے۔

☆ ترائن کی جنگ میں سلطان معزالدین محمد غوری، رای پتھورا اور گوبند کی قیادت میں صف آراء ہندوستانی فوج پر ایک نیزے کے ساتھ شیر کی طرح دھاڑتے ہوئے حملہ آور ہوجاتا ہے اور ہاتھیوں کی کوئی پرواہ نہیں کرتا۔

شنیدم خود آن خسرو چیرہ دست — خروشید و جوشید چو شیر مست
نہ در پیل دید و نہ در پیلبان — یکے حملہ آورد بر ہندوان
شنیدم بدستش یکے نیزہ بود — چو خود راند خسرو بقصد ہنود

☆ بلبن کے بیٹے شہزادہ محمد خان کے خلاف جب مغل فوج حملہ آور ہوئی تو شہزادہ اس کا سامنا نہیں کر پایا اور میدان جنگ میں شہید ہوگیا۔

خرو شید فوج مغل ناگہاں — بزد ہوئے بر رسم خود یکزماں
وزان پس بجنبید از ہرطرف — بزد برصفِ ہندیان صف بہ صف
چوخان دید غوغائے فوج مغل — بگفتا زدن کوس و نائے دھل

نبرد آزمائی کا منظر

عصامی نے میدان جنگ میں نبرد آزمائی کے مناظر کو بہت ہی روانی، عمدگی اور سادگی کے ساتھ پیش کیا ہے کہ جنگ کا عالم قاری کی نظروں میں واضح ہوجاتا ہے۔

☆ مقابل فوج کو راہ فرار اختیار کرتے ہوئے دیکھ کر سلطان معزالدین محمد بن سام کا اپنی فوج کی دائیں اور بائیں صفوں کے فوجی سرداروں کو حکم دیتا کہ رای پتھورا (پرتھوی راج) کو زندہ گرفتار کیا جائے۔

چو مجروح شد پیلبانی سہ چار — سراسر صف پیل شد در فرار
چو شہ دید فوج عدو در فرار — بفر مودتا ازیمین و یسار
بجنبند یکسر سرانِ سپاہ — بتازند با لشکرِ کینہ خواہ
خود از قلب جنبید باسرکشان — ہمہ نیزہ و تیر و خنجرکشان
صف ِترک شد چیرہ زان دست برد — کہ ہندوعنان در حزیمت سپرد
ہمہ سر فرازان برآورد تیغ — براندند برہندوان بیدریغ
پتھورا ہماں رائے اقلیم گیر — بدستِ سپہ زندہ آمد اسیر

☆ بلبن کے بیٹے شہزادہ محمد خان پر مغل افواج کے پرزور حملہ میں مغل افواج غالب آ گئے اور ہلاکت خیز لڑائی کے نتیجہ میں شہزادہ مارا گیا۔

غالب آ گئے اور ہلاکت خیز لڑائی کے نتیجہ میں شہزادہ مارا گیا۔

مغل چیرہ شد تیغها برکشید صف چند دیگر ز ہرسو درید
خلل گشت بنیادِ افواج ہند قضا گشت راضی بتاراج ہند
ہم آخر مغل چونکہ بسیار بود ز ہرسو بیکبارہ زوری نمود

☆ عصامی نے میدان جنگ کے مختلف مراحل مثلاً صف آرائی، حملہ آوری، نبرد آزمائی، پسپائی یا فتح وشکست کے سلسلہ کی اپنی جادو بیانی سے بڑی عمدہ تصویر کشی کی ہے۔ اس کے علاوہ اس نے مختلف قسم کی جنگوں کو بھی پیش کیا ہے۔ مثلاً گھیراؤ کر کے حملہ آور ہونا، رات اور دن کی مسلسل لڑائی، دھینگا مشتی اور ہاتھا پائی، قلعوں کے محاصرے، کمین گاہ میں گھات لگا کر حملہ کرنا، جیسی جنگی تفصیلات بھی بڑے ہی موثر اور جاندار تصاویر کی صورت میں پیش کیا ہے۔ گھیراؤ کر کے حلقہ بنا کر حملہ آور ہونے کا بیان بہت عمدہ ہے۔ علاء الدین خلجی کی مغلوں سے لڑائی کے موقع پر ظفر خان جو کہ دائیں صف کا سردار تھا شاہی فرمان کا انتظار کئے بغیر اپنے فوجی دستہ کو لیکر آگے بڑھ گیا اور پسپا ہوتی ہوئی مغل فوج کے ایک لشکر کا تعاقب کیا۔ کافی دور نکل آنے کے بعد مغل فوج نے یکجا ہو کر اس کا گھیراؤ کیا اور ان کی راہ کو حلقے میں مسدود کر کے تمام فوجی دستہ کو ظفر خان کے ساتھ ختم کر دیا۔ اس واقعہ کو شعری سانچہ میں کچھ اس طرح ڈھالا ہے۔

تمامی بیکبارگی ہو زدند بسے مہروطاس ہرسو ز دند
یکے حلقہ کردند بر گرد خان چوبر گردِ مہ فوج سیارگان
وزان پس زہر سو بر آشوفتند بیکبارگی حملہ بر کوفتند
درآمد سوارِ مغل ہر طرف صف ہند شد چون بہ میدان ہدف
ہم آخر چوتیری بہ ترکش نماند گریزی بہ شیران سرکش نماند
ظفر خان ھمان سرکش نامدار بسے تیغہا زد دران کارزار

محاصرہ کا بیان:

عصامی نے بڑی تفصیل کے ساتھ متعدد محاصروں کو نظم کیا ہے، اس کا بیان بہت رواں اور صاف ہے۔

☆ رنتھنبور کی جنگی مہم میں سلطان علاء الدین خلجی نے ایک سال کے طویل عرصہ تک قلعہ کا محاصرہ کیا تھا، جس کی تفصیل عصامی نے پانچ ابواب میں بہت ہی صراحت سے کی ہے۔ وہ اس واقعہ کے ہر چھوٹے بڑے نکتہ سے ہمیں آگاہ

کرتا ہے کہ کس طرح سلطان نے جنگی تدابیر کو اختیار کیا تا کہ قلعہ فتح ہو اور کس طرح محصور فوج کے حملوں کا جواب دیا گیا۔ بالآخر سلطان نے خندق کو بھرنے کے اقدام میں کامیابی حاصل کی اور قلعہ کو تسخیر کر لیا۔

دگر روز خسرو بصد داروگیر — سپہ راند برقصد حصن ہمیر
سپہ خیمہ زد گردِ گرد حصار — ہمی کرد ہر روز و شب کارزار
زغضبان اگر رفت سنگی درون — گران ترازان سنگی آید برون
بیک سال کامل دران روزگار — نیفتاد نقصانی اندر حصار
چو پرگشت خندق یلان سپاہ — ہمی جنگ کردند بیگاہ گاہ

چنانچہ شاہنامہ عصامی، ہندوستانی فارسی کی رزمیہ شاعری کی پہلی مثال ہے اور عبدالملک عصامی ہندوستان کے فارسی شعرا میں عام طور پر اور دکن کے شعراء میں خصوصیت سے رزمیہ شاعری کے امام کی حیثیت رکھتا ہے اور بجا طور پر ''**فردوسی دکن**'' بلکہ ''**فردوسی ہند**'' کہلانے کا مستحق ہے۔

﴿حواشی﴾

۱) عصامی، فتوح السلاطین۔ یعنی شاہنامۂ ہند، بہ تصحیح۔ ڈاکٹر آغا مہدی حسین، آگرہ۔ ۱۹۳۸ء

۲) آغا مہدی حسین، **دی فردوسی آف انڈیا**، پروسیڈنگس آف دی انڈین ہسٹری کانگریس، لاہور، ۱۹۴۰ء صفحہ ۲۰۱

۳) سید یوشع۔ **عصامی نامہ**۔ مدارس 1937ء

۴) صباح الدین عبدالرحمٰن سید ''**فتوح السلاطین**'' معارف شمارہ نمبر ۴۴، ۱۹۳۸، صفحہ ۴۴۹

۵) ہارون خان شیروانی۔ **دکن کے بہمنی سلاطین** (مترجم رحم علی الہاشمی) دہلی 1978

۶) پرفیسر خلیق احمد نظامی، **سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات**، دہلی 1958

۷) Phillips, **Historians of India, Pakistan and Ceylone** London , 1967 p.124

۸) M.A.Ghani,**Pre Moghal Persian in Hindustan**,Allahabad, 1941, page 284

۹) S.A.Q. Hussaini - **Bahman Shah** (The Foundation of the Bahmani Kingdom) Culcutta, 1960

۱۰) Husain, Agha Mahdi- Rise and Fall of Mohammad Bin Tughlaq, London, 1938

آئینۂ تحقیق

''دبیر'' کے اس خصوصی کالم کے تحت اول شمارہ سے ہی کسی نا کسی دانشگاہ میں ہونے والے تحقیقی کاموں کی فہرست پیش کی جاتی رہی ہے اس مرتبہ ایک فہرست پٹنہ یونیورسٹی کے پایان ناموں کی پیش جارہی ہے۔ وہیں ایک مقالہ پاکستان کی نمل یونیورسٹی میں ہونے والے تحقیقی کاموں پر بھی اس کالم میں شامل ہے۔ (مدیر)

فہرست پایان نامہ ہائے شعبہ فارسی، دانشگاہ پٹنہ، بہار

ڈاکٹر عابد حسین، صدر شعبۂ فارسی، پٹنہ یونیورسٹی، بہار

نمبر شمار	دانش پژوہ	عنوان پایان نامہ
۱	دکتر اقبال حسین	سخن سرایان قدیم فارسی در ہند
۲	دکتر خواجہ افضل امام	احوال و آثار مرزا محمد قلی سلیم تہرانی
۳	دکتر محمد صدیق اشرف	احوال و آثار ملا سعید اشرف و تصحیح مثنویہای او
۴	دکتر سید محمد انوار احمد	موہن لال انیس و تذکرۂ او انیس الاحباء
۵	دکتر زبیر احمد قمر	تذکرہ ہمیشہ بہار از کشن لال اخلاص
۶	دکتر ارتضیٰ حسن رضوی	شاہ نور الحق تپاںؔ مع احوال و آثار
۷	دکتر شمس الحق	مسیحا کاشی و احوال و آثار او
۸	دکتر ایم اے مظفر	احوال و آثار غلام حسین خاں
۹	دکتر محمد یحییٰ ابدالی	ملفوظات و مکتوبات صوفیای بہار در فارسی در قرن چہار دہمین
۱۰	دکتر سید ولی اللہ سلفی	احوال و آثار شیخ سعد اللہ مسیحا کیرانوی مع تصحیح مثنوی ''رام و سیا''
۱۱	دکتر غلام مجتبیٰ انصاری	درویش والہ مع تصحیح تخلیقات او
۱۲	دکتر حسن امام	احوال و آثار حضرت احمد لنگر دریا بلخی
۱۳	دکتر محمد شرف عالم	ہجو گوئی در سخن سرای فارسی
۱۴	دکتر محمود عالم	مرثیہ نویسی در سخن سرائی فارسی (تا دورۂ قاچار)

۱۵	دکتر نہال احمد	احوال وآثار مرزا فاخر مکین مع تصحیح مجموعہ مکتوبات اوگلزار جعفری
۱۶	دکتر محمد طیب صدیقی	تصحیح نل دمن فیضی
۱۷	دکتر عبدالغفور	مرزا فصیحی ہروی مع تصحیح آثار او
۱۸	دکتر ایس ایس مطیع الرحمٰن	نعت گوئی در فارسی (تا قرن نوزدہم میلادی)
۱۹	دکتر علی حیدر نیر	احوال وآثار عبدالحمید پریشان مع تصحیح دیوان
۲۰	دکتر شاکر احمد یحیٰی	حسین نوشاہ توحید مع احوال وآثار
۲۱	دکتر حبیب المرسلین	خواجہ حسین سنائی مشہدی مع احوال وآثار
۲۲	دکتر خانم خورشید جہان	کتابہای سفرنامۂ فارسی
۲۳	دکتر حافظ ظہیر الحسن صدیقی	ناصر علی سرہندی ومثنویہای او
۲۴	دکتر توحید عالم	آثار نثر فارسی بعد از اورنگ زیب تا ۱۸۵۷ میلادی
۲۵	دکتر محمد غفار صدیقی	سبک ہندی در سخن سرائی فارسی
۲۶	دکتر ایم ایم کمال صبا	خدمات شیخ شرف الدین یحیٰی منیری در نثر فارسی
۲۷	دکتر یٰسین انصاری	شاپور مع تصحیح اشعارش
۲۸	دکتر عبدالقیوم	خدمات خانقاہ مجیبیہ در سخن سرائی فارسی
۲۹	دکتر محمد عابد حسین	تصحیح کلیات میر یحیٰی کاشی مع احوال وآثار
۳۰	دکتر بلقیس آفاق	احوال وآثار عین الحق واقف
۳۱	دکتر عید محمد انصاری	تدوین انتقادی مکتوبات خطی شرف الدین یحیٰی منیری
۳۲	دکتر محمد اسداللہ	احوال وآثار شمس الدین در بھنگوی
۳۳	دکتر محمد کمال الدین مضطر	احوال وآثار ارادت خان واضح
۳۴	دکتر محمد شہاب الدین	اندیشہ ہای مذہبی مخدوم الملک در تناظر مکتوبات
۳۵	دکتر محمد صابر علی	مرزا وحید قزوینی مع تصحیح ریاض التواریخ
۳۶	دکتر قاضی عبدالوارث	علی نقوی: شاعر معروف دولت صفویہ
۳۷	دکتر سید امام الدین	چند تا سخن سرایان فارسی گویان بہار
۳۸	دکتر محمد عثمان	مرزا ابوطالب وتصحیح خاتمہ خلاصۃ الافکار

۳۹	دکتر احمد حسین	شعر گوئی فارسی در ہند
۴۰	دکتر قیس محمد	صوفی مازندرانی مع احوال و آثار
۴۱	دکتر سید مظاہر عالم	شعر گوئی فارسی مرزا غالب و فن او
۴۲	دکتر محمد بدیع الزماں	احوال و آثار سید حسن خالص
۴۳	دکتر طلحہ رضوی برق	مشائخ سخن پردازان بہار مخصوصاً سجادہ نشینان و دارایان خانقاہ
۴۴	دکتر محمد علی ارشد	احوال و آثار جناب حضور شاہ امین احمد فردوسی
۴۵	دکتر احسان کریم برق	تصحیح دیوان ترابی
۴۶	دکتر خانم شوکت آراء	احوال و آثار طاہر وحید قزوینی
۴۷	دکتر خانم حلیمہ نکہت	تصحیح دیوان وللہ ہروی
۴۸	دکتر مسعود احمد	تصحیح دیوان ظہور اللہ خاں مع احوال و آثار
۴۹	دکتر صوفیہ نسرین	احوال و آثار عبد الرزاق فیاض لاہیجانی
۵۰	دکتر حسن الدین حیدر	شعر گوئی فارسی در عہد قاچار
۵۱	دکتر محمد اویس عالم	احوال و آثار ملا طغریٰ
۵۲	دکتر محمد رضوان اللہ	تصحیح دیوان طلعت پھلواری مع احوال و آثار
۵۳	دکتر محمد محفوظ الرحمٰن	احوال و آثار امامی ہروی
۵۴	دکتر محمد شمیم سرور	تخلیقات نثر فارسی مخدوم منعم
۵۵	دکتر سرمد جمال	دو تا شاعر فارسی گوی بہار: حضرت فردو حضرت نصر
۵۶	دکتر مشتاق عالم	شاگردان ذوالسانین فاخر مکین
۵۷	دکتر محمد ابوالقیس	تصحیح تخلیقات ادبی مرزا محمد حسن قتیل
۵۸	دکتر ذاکر حسین	مطالعہ انتقادی تخلیقات ادبی امام بخش صہبائی
۵۹	دکتر سعد اللہ قادری	خدمات سید محمد شعیب نیر پھلواری در ادبیات فارسی
۶۰	دکتر محمد خالد حسین	احوال و آثار فوقی یزدی
۶۱	دکتر صدر عالم	تدوین انتقادی دیوان نسبتی تھانیسری مع احوال و آثار
۶۲	دکتر پرویز انجم	تصحیح مثنویات طاہر وحید قزوینی مع احوال و آثار

۶۳	دکتر محمد شبلی نعمانی	تصحیح دیوان امید مع احوال و آثار
۶۴	دکتر خلیل احمد	تصحیح تحفۃ الصغر امیر خسرو مع احوال و آثار
۶۵	دکتر سید محمود عالم	تصحیح معراج الخیال وزیر علی عبرتی مع احوال و آثار
۶۶	دکتر خانم شاہدہ خانم	مرزا فاخر مکین: یک جائزہ انشاء نگاری و شعر گوی او
۶۷	دکتر محمد صابر حسین	تدوین ریاض التواریخ از مرزا وحید قزوینی
۶۸	محمد نظیر احمد خان	بہار میں فارسی ادب ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء
۶۹	محمد مرشد اکرم	تنویرات شاہ ظہور الحق عمادی کا تنقیدی جائزہ
۷۰	محمد اسرار الحق	مولانا حفیظ الدین لطیفی حیات و کارنامے
۷۱	انصار الحق	طاہر وحید قزوینی کی غزلیات کا تنقیدی جائزہ
۷۲	محمد مختار عالم	راجہ رتن سنگھ زخمی کے دیوان کا تنقیدی جائزہ
۷۳	فردوس بانو	سید شاہ حسین عطاء الرحمن کاکوی حیات و کارنامہ
۷۴	نکہت جہان	مرزا اسد اللہ خان غالب کے فارسی کارناموں کا تنقیدی جائزہ

شعبۂ فارسی: نمل یونیورسٹی (پاکستان) کی تحقیقی خدمات

ڈاکٹر حمیرا شہباز، لیکچرر، شعبہ زبان و ادبیات فارسی، نمل یونیورسٹی، اسلام آباد، پاکستان

فارسی زبان کا سرزمین پاکستان سے دیرینہ تعلق ہے، رابعہ خضداری کے زمانے سے آج تک اس خطے میں فارسی شعر و ادب رائج ہے۔ فارسی زبان کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے قیام پاکستان سے ہی اس کی تدریس جاری ہے، حکومت پاکستان کی توجہ اور اساتذہ کی محنت اور خانہ فرہنگ ایران کے تعاون سے فارسی زبان کی ترویج و ترقی ممکن ہوسکی اور آج پاکستان کے ہزاروں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں فارسی کی تعلیم جاری ہے(۱)۔ اس سلسلے میں نمل: نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجیز زبان آموزی کے لئے نہ صرف پاکستان بلکہ ایشیا کی سب سے بڑی درسگاہ تسلیم کی جاتی ہے، شعبہ فارسی نمل کے مقدم ترین شعبوں میں سے ایک ہے۔ ۱۹۷۰ء میں نمل (NIML) ایک ادارے کے طور پر وجود میں آیا (۲)۔ فارسی ان پہلی چند زبانوں میں سے ایک ہے جن کی تدریس سے اس ادارے کا آغاز ہوا تھا۔ نمل کو ۲۰۰۰ء میں نَمل (NUML) یعنی (۳) یونیورسٹی کا درجہ عطا کیا گیا۔ نل زندہ زبانوں کی تعلیم و تدریس کی منفرد درسگاہ ہے جس کو تقریباً ۲۷ قومی زبانوں اور پاکستان کی علاقائی زبانوں کی تدریس میں خاص مقام حاصل ہے۔ اسلام آباد میں یونیورسٹی کے مرکزی کیمپس کے علاوہ سات بڑے شہروں لاہور، فیصل آباد، کراچی، کوئٹہ، حیدرآباد اور ملتان میں علاقائی کیمپسز کارفرما ہیں۔

شعبہ زبان و ادب فارسی میں بنیادی کورسز، سرٹیفکیٹ، ڈپلومہ اور مترجمی کے علاوہ اعلیٰ تعلیم سطح: بی ایس، ایم اے، ایم فل اور ڈاکٹریٹ کے کورسیز کی تدریس کا اہتمام فارسی زبان میں کیا جاتا ہے۔

نمل میں تدریس فارسی کے مقاصد (۴):

- ☆ درخشان ماضی سے آشنائی
- ☆ فارسی زبان کے عظیم سرمایہ اور اسلامی تہذیب کا تحفظ
- ☆ علامہ اقبال کی انقلاب آفرین افکار سے آشنائی
- ☆ طلباء میں ادبی ذوق اور تحقیقی روح کی خلاقیت اور تقویت

شعبہ فارسی، نمل میں مذکورہ بالا مقاصد اور تمام اعلیٰ سطح کی ڈگریوں کے حصول کی خاطر آخری تعلیمی سمیسٹر میں فارسی زبان اور ادب میں تحقیق لازمی مرحلہ ہے۔ یہ روش روز اول سے نمل یونیورسٹی میں متداول ہے۔ اس تحقیقی عمل کو موثر بنانے کے لئے نمل کا مرکزی کتابخانہ، نذیر لائبریری، اتاق ایران شناسی، شعبہ فارسی نمل، اور مرکز تحقیقات فارسی ایران و

پاکستان اسلام آباد کا کتابخانہ گنج بخش محققین کے لئے بنیادی وسائل کی فراہمی کے لئے اہمیت کا حامل ہے۔

شعبہ فارسی نمل میں آغاز کار سے رواں سال (۲۰۱۵ء) تک کے فارسی زبان وادب پر بی ایس، ایم اے، ایم فل، اور پی ایچ ڈی کی ڈگریوں کے حصول کی خاطر طلباء کی پر ارزش تحقیقی کاوشیں، پایان ناموں کی صورت میں محفوظ ہیں۔ان کے عناوین کی فہرست بی الترتیب سال تکمیل مندرجہ ذیل ہے(۵):

فہرست پایان نامہ ہای بی ایس ایم ایل(۶)

شمارہ	عنوان مقالہ	محقق، نگارندہ	استادراہنما	سال
۱	ترجمہ افسانہ ہای چینی بہ زبان فارسی (ترجمۂ ۲۷ داستان چینی)	ابراہیم (Jin Wei)	دکتر فرشتہ آہنگری	۲۰۱۴ء
۲	ترجمہ افسانہ ہای چینی بہ زبان فارسی	یی لی شاتی (Yilli Xiati)	دکتر فرشتہ آہنگری	۲۰۱۴ء

فہرست پایان نامہ ہای ایم اے

شمارہ	عنوان مقالہ	محقق	استادراہنما	سال
۱	جمال زادہ وشیوۂ داستان نویسی او با برخی از آثارش	نام تک کیم	دکٹور کلثوم فاطمہ سید	۱۹۸۸ء
۲	شرح و بررسی منتخبی از اشعار پروین اعتصامی	انجم حمید	دکتر محمد علوی	۱۹۸۸ء
۳	احوال و آثار و افکار حضرت بلہی شاہ	محمد اقبال	دکتر کلثوم فاطمہ سید	۱۹۸۹ء
۴	احوال و آثار و افکار حضرت سلطان باہو	منیر جہان	دکتر کلثوم فاطمہ سید	۱۹۸۹ء
۵	بررسی افکار اخلاقی گلستان سعدی	ّرلی لوون	دکتر محمد علی مقدم، دکتر علی پیرنیا	۱۹۸۹ء
۶	ترجمہ بخش از کتاب یوسف بن تاشفین: تالیف نسیم حجازی	ادیبہ صالح	دکتر شگفتہ موسوی	۱۹۸۹ء
۷	ترجمہ بخش از کتاب یوسف بن تاشفین: تالف نسیم حجازی	عدیلہ انور	دکتر شگفتہ موسوی	۱۹۸۹ء
۸	احوال و آثار ملک الشعراء محمد تقی بہار و نقش وی در نہضت مشروطیت	اطہر مہدی	دکتر کلثوم فاطمہ سید	۱۹۹۰ء
۹	اوضاع سیاسی و فرہنگی و ادبی قرن ہفتم ہجری ۱۲۰۳	شمع غوری	دکتر علی پیرنیا	۱۹۹۰ء
۱۰	عشق از دیدگاہ سعدی	فرزانہ ماجد	دکتر کلثوم فاطمہ سید	۱۹۹۱ء

۱۱	تجزیہ وتحلیل وبیان داستان سیاوش (برگرفتہ از کتاب ارجمند شاہنامہ اثر جاودان حکیم ابوالقاسم فردوسی)	مہناز منور	آقای علی پیرنیا	۱۹۹۲ء
۱۲	وضع سیاسی وجغرافیائی، ادبی وفرہنگی دورۂ سلجوقی	نسیم اختر	دکتر کلثوم فاطمہ سید	۱۹۹۲ء
۱۳	احوال وآثار وافکار سید جمال الدین افغانی	شفیق الرحمٰن	دکتر سید سراج الدین، دکتر کلثوم فاطمہ سید	۱۹۹۴ء
۱۴	ترجمہ بخش از کتاب یوسف بن تاشفین: تالیف نسیم حجازی	سیدہ شازیہ مظہر	آقای علی پیرنیا	۱۹۹۴ء
۱۵	پایان نامہ ہای شرح احوال وآثار مولانا الطاف حسین حالی	حمیرا ناہید	دکتر مہر نور محمد خان، دکتر محمد سرفراز ظفر	۱۹۹۴ء
۱۶	شرح احوال وآثار حضرت فرید الدین مسعود گنج شکر وتصحیح رسالہ تحفۃ الرسالہ	تبسم ملک	دکتر سرفراز ظفر، دکتر مہر نور محمد خان	۱۹۹۴ء
۱۷	شرح احوال وآثار وافکار امیر خسرو دہلوی	رخسانہ یاسمین	دکتر کلثوم فاطمہ سید	۱۹۹۴ء
۱۸	شرح احوال وآثار وافکار نیما یوشیج	کنیز آمنہ منہاس	دکتر علی پیرنیا	۱۹۹۴ء
۱۹	بررسی سبک واندیشہ شاعران دورۂ قاچار تا پایان قرن سیزدہم ہجری	عائشہ رانی	دکتر علی پیرینا	۱۹۹۵ء
۲۰	بررسی شاعران آزادیخواہ درمشروطیت ایران	امبر یاسمین	دکتر مہر نور محمد خان	۱۹۹۵ء
۲۱	شرح احوال وآثار وشعر فارسی مولانا شبلی نعمانی	مہناز فاطمہ	دکتر سرفراز ظفر	۱۹۹۵ء
۲۲	مثنوی جنگ ہاجو (در وقائع لشکر کشی اسلام خان بہ کوچ و آسام): سرودۂ محمد قلی سلیم تہرانی	سعدیہ سرور	دکتر مہر نور محمد خان	۱۹۹۵ء
۲۳	مثنوی چاہ وصال سرودۂ سید احمد سند	ناہید اشفاق	دکتر محمد سرفراز ظفر ملک	۱۹۹۵ء
۲۴	مروری بر افکار وتعلیمات ناصر خسرو وتاثیر آن بر مناطق شمالی پاکستان	بی بی سلیمہ شمشیر امان	دکتر کلثوم فاطمہ سید	۱۹۹۵ء
۲۵	تحقیق وبررسی درمورد شعر وشاعران قرن دوازدہم	روزینہ رشید	دکتر طاہرہ اکرم	۱۹۹۷ء
۲۶	ترجمہ بخشی از کتاب یوسف بن تاشفین از نسیم حجازی	محمد آصف رضا	دکتر محمد حسین تسبیحی رہا، دکتر رشیدہ حسن	۱۹۹۷ء

۲۷	تصحیح و مقابسہ نسخہ ہای خطی رسالہ ''محبت الاسرار'' : تالیف سلطان العارفین، حضرت سلطان باہو	اعجاز احمد	دکتر کلثوم فاطمہ سید	۱۹۹۷ء
۲۸	شعر کارگری در ادبیات فارسی	نیر عسکری	دکتر مہر نور محمد خان	۱۹۹۷ء
۲۹	اصطلاحات وترکیبات وواژہ ہا بعد از انقلاب در شعر فارسی	سید قیصر عباس کاظمی	دکتر محمد مہدی توسلی	۱۹۹۸ء
۳۰	تصحیح رسالہ المریدین'' مولف محمد جلای شاہی	عندلیب فاروق	دکتر رشیدہ حسن	۱۹۹۸ء
۳۱	سمع در کشف المحجوب	ارشاد بیگم	محمد حسین تسبیحی (رہا)	۱۹۹۸ء
۳۲	مقام غالب در شعر فارسی	روبینہ فردوس	دکتر کلثوم فاطمہ سید	۱۹۹۸ء
۳۳	آداب صحبت در کشف المحجوب	سیدہ کاشفہ ناز	دکتر سرفراز ظفر	۱۹۹۹ء
۳۴	بررسی نثر بعد از انقلاب اسلامی ایران	شازیہ عباسی	دکتر محمد مہدی توسلی	۱۹۹۹ء
۳۵	تاریخ جشن نوروز باذکر نمونہ ہای از شعر فارسی	ریحانہ ارم	دکتر محمد حسین تسبیحی	۱۹۹۹ء
۳۶	تعلیقات وحواشی زبور عجم علامہ اقبال	گلفام علی ناصر	دکتر کلثوم فاطمہ سید	۱۹۹۹ء
۳۷	جلوۂ اساطیر وداستانہای تاریخی در اسرار ورموز اقبال	شاہد احمد	دکتر کلثوم فاطمہ سید	۱۹۹۹ء
۳۸	سیری در جہان اقبال	حمیرا یاسمین	مہر نور محمد خان	۱۹۹۹ء
۳۹	شعر حماسی در ادبیات فارسی کشمیر	سعدیہ بتول	دکتر رشیدہ حسن	۱۹۹۹ء
۴۰	مرثیہ سرای فارسی در شبہ قارہ (از دورۂ غزنویان تا پایان دورۂ گورکانیان ہند)	مریم زہرا	محمد حسین تسبیحی	۱۹۹۹ء
۴۱	نقش اقبال در نہضت پاکستان وترجمۂ نامہ ہای اقبال بہ جناح	احمد عباس	دکتر سید سراج الدین	۱۹۹۹ء
۴۲	تطبیق و مقالہ وتصحیح جامع الحکایت ولوامع الروایات از باب ۱۶ تا ۲۰ با تعلیقات وتوضیحات لازم	جبین ناز	دکتر کلثوم فاطمہ سید	۲۰۰۰ء
۴۳	تصحیح نسخہ ہای خطی (پنج رسالہ از میر سید علی ہمدانی)	عظمیٰ نورین	دکتر سعید بزرگ بیگ دلی	۲۰۰۱ء
۴۴	توضیحات وتعلیقات ارمغان حجاز اقبال	محمد فیاض	دکتر مہر نور محمد خان	۲۰۰۱ء
۴۵	دیوان میرزا مظہر جان جانان	شازیہ تبسم	سید رضا مصطفوی	۲۰۰۱ء

۴۶	شرح وتوضیحات وتعلیقات مثنویات مرزا غالب	افشین کاشفہ	دکتر سرفراز ظفر	۲۰۰۱ء
۴۷	مدارج النبوہ و درجات الفتوہ، تالیف : مولانا شیخ عبدالحق محدث	نادیہ سرور	دکتر محمد حسین تسبیحی (رہا)	۲۰۰۱ء
۴۸	احوال وآثار وشرح سرودہ ہای فارسی خوشحال خان ختک	شاذیہ نذیر	دکتر محمد سرفراز ظفر	۲۰۰۲ء
۴۹	احوال وآثار وشرح سرودہ ہای فارسی مرزا محمد رفیع سودا	لبنیٰ محمود	دکتر رشیدہ حسن	۲۰۰۲ء
۵۰	شرح احوال وآثار عاقل خان رازی وتصحیح مثنوی مہر وماہ	صبا مکرم	دکتر طاہرہ پروین	۲۰۰۲ء
۵۱	شرح وتعلیقات سرودہ ہای صوفی غلام مصطفیٰ تبسم	شگفتہ یٰسین عباسی	دکتر طاہرہ پروین	۲۰۰۲ء
۵۲	تصحیح منتخب دیوان آقا محمد کاظم والہ اصفہانی وشرح احوال او	محمد صفیر	محمد حسین پروین	۲۰۰۲ء
۵۳	میر ناصر علی سرہندی واحوال وآثار شاعر	رابعیہ کیانی	دکتر رشیدہ حسن	۲۰۰۳ء
۵۴	شعر حبسیہ در ادبیات فارسی	وجیہ حفیظ	دکتر رشیدہ حسن	۲۰۰۶ء
۵۵	کلمات وتراکیب فارسی واشارات داستانی (۳۸ غزل) در دیوان اردوی غالب دہلوی	افشین امتیاز	دکتر طاہرہ پروین	۲۰۰۶ء
۵۶	بررسی تحقیق در نثر فارسی دورۂ مشروطیت	عنبرین نثار	دکتر مہر نور محمد خان	۲۰۰۷ء
۵۷	پایہ گذاران داستان کوتاہ ادبیات فارسی از جمال زادہ تا جلال آل احمد	حنا عزیز	دکتر طاہرہ پروین	۲۰۰۷ء
۵۸	تحقیق دربارۂ احوال وآثار وافکار وشعر فارسی نظیر اکبر آبادی	تصور نساء	دکتر محمد سرفراز ظفر	۲۰۰۷ء
۵۹	توضیحات وتعلیقات اسرار خودی اقبال	نازیہ نواز	دکتر رشیدہ حسن	۲۰۰۷ء
۶۰	چشم اندازی بہ سیر معنوی تصوف وعرفان اسلامی	صغریٰ بتول	دکتر سید سراج الدین	۲۰۰۷ء
۶۱	شرح حال وآثار وکلام فارسی پیر سید مہر علی شاہؒ گیلانی گولوری	سید مہر فرید الحق گیلانی	دکتر رشیدہ حسن	۲۰۰۷ء
۶۲	شرح وتعلیقات سرودہ ہای قائم چاند پوری	مہوش رمضان	دکتر مہر نور محمد خان	۲۰۰۷ء
۶۳	نگاہی گذرا بہ نثر فارسی در روزگار صفویہ	حنا ارشاد	دکتر طاہرہ پروین	۲۰۰۷ء
۶۴	نہضت بازگشت ادبی ونقش آن در تحول شعر فارسی	نازش صدیقی	دکتر رشیدہ حسن	۲۰۰۷ء
۶۵	تحقیق وبررسی در چگونگی شعر فارسی عرفانی در عصر سلجوقی	محبوب مہربانو	دکتر طاہرہ پروین	۲۰۰۹ء

۶۶	تحقیق و بررسی در چگونگی شعر فارسی در دورۂ تیموریان	محمد اسحاق	دکتر رشیدہ حسن	۲۰۰۹ء
۶۷	تحقیقی و بررسی در شعر دورۂ مشروطیت	حمیرا اکبر	دکتر طاہرہ پروین	۲۰۱۰ء
۶۸	بازتاب تلمیحات در غزلہای فارسی غالب	عطاء الکریم	دکتر رشیدہ حسن	۲۰۱۳ء
۶۹	بررسی تحلیلی رمان پری چہر با شرح احوال و آثار محمد حجازی	مصور احمد طاہر	دکتر طاہرہ پروین	۲۰۱۳ء
۷۰	ترجمہ امیر خسرو: فردوتاریخ با حواشی و تعلیقات	نعمان	دکتر محمد سرفراز ظفر	۲۰۱۳ء
۷۱	ترجمہ مقالات حافظ شیرانی (جلد پنجم) با حواشی و تعلیقات بخش دورۂ سامانی	یاسر شہزاد	شگفتہ یاسین عباسی	۲۰۱۳ء
۷۲	ترجمہ سخنوران فارس (بخش دوم) با حواشی و تعلیقات	کاشف علی	دکتر محمد سرفراز ظفر	۲۰۱۳ء
۷۳	تلمیحات در شعر پروین اعتصامی	خالد اسد	دکتر رشیدہ حسن	۲۰۱۳ء
۷۴	نگاہی بہ ابعاد مختلف شخصیت ملک الشعراء بہار	فضل بصیر	دکتر رشیدہ حسن	۲۰۱۴ء
۷۵	استخراج لغات و اصطلاحات پنج داستان او دید و باز دید آل احمد	بشریٰ گیلانی	دکتر فرشتہ آہنگری	۲۰۱۴ء
۷۶	نگاہی بہ ابعاد مختلف شخصیت علی اکبر دہخدا	راشد نوید	طاہرہ پروین	۲۰۱۴ء
۷۷	استخراج لغات و اصطلاحات پنج داستان از دید باز دید آل احمد	نورینہ نواب	دکتر فرشتہ آہنگری	۲۰۱۴ء

فہرست پایان نامہ ہای ایم فل

شمار	عنوان رسالہ	محقق، نگارندہ	استاد راہنما	سال
۱	نقد و تحلیل دیوان پروین اعتصامی	رابعہ کیانی	دکتر مہر نور محمد خان	۲۰۱۲ء

پایان نامہ ہای دکتری

شمارہ	عنوان رسالہ	محقق، نگارندہ	استاد راہنما	سال
۱	تحقیق در احوال و آثار مخدوم جہانیان جہانگشت و تصحیح ملفوظات ''خزانۃ الجواہر الجلالۃ'' (بخش دوم)	سیدہ پروین زہرا گردیزی	دکتر محمد سرفراز ظفر	۲۰۰۲ء
۲	تحقیق و بررسی شخصیت عرفانی، معنوی و ادبی سید محمد نوربخش و نقش عقاید نوربخشیہ در شبہ قارہ	علی	دکتر محمد سرفراز ظفر	۲۰۰۲ء

۳	علامہ اقبال در عرصہ ی ادبیات و فرہنگ افغانستان	اسداللہ محقق	دکتر مہر نور محمد خان	۲۰۰۲ء
۴	بررسی و تحقیق در فکر و ہنر داستان نویسی سیمین دانشور	امبر یاسمین	دکتر مہر نور محمد خان	۲۰۱۲ء
۵	تصحیح و تدوین رسائل و قطعات طغرای مشہدی	زاہدہ لودھی	دکتر طاہرہ پروین	۲۰۱۵ء
۶	بررسی و تحلیل محتوایی ۔تاریخی سیر اقبال شناسی در ایران	حکیمہ دست رنجی	دکتر مہر نور محمد خان	۲۰۱۵ء

کل تعداد پایان نامہ ہا تا ۲۰۱۵ء:۔ بی ایس ایم ایل ۔۲، ایم اے ۔۷۷، ایم فل ۔۱، پی ایچ ڈی ۔۶

﴿حواشی﴾

(۱) مجموعہ مقالات ششمین مجمع بین المللی استادان زبان و ادبیات فارسی تہران، مقالہ: موقعیت زبان و ادبیات فارسی در پاکستان و چالش ہا، مہر نور محمد خان، مجموعہ مقالات ششمین مجمع ۔۔۔، ص ۸۵۷، (۲) نیشنل انسٹیٹیوٹ آف ماڈرن لینگویجیز (۳) نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجیز، (۴) شناخت نامہ گروہ زبان و ادبیات فارسی، دانشگاہ نمل، اسلام آباد

(۵) ان پایان ناموں کی معلومات مختلف ذرائع سے حاصل کی گئی ہے: (نذیر لائبریری، نمل کاتھیسیز سیکشن، اتاق ایران شناسی، شعبہ فارسی نمل، اور کتاب خانہ گنج بخش مرکز تحقیقات فارسی ایران پاکستان۔ اسلام آباد، خود محققین اور ان کے راہنما اساتذہ سے)، (۶) Bachelor's of Sudies in Modern languages (4 Year Programme)

﴿منابع و مآخذ﴾

(۱) مجموعہ مقالات ششمین مجمع بین المللی استادان زبان و ادبیات فارسی تہران، بہ کوشش دکتر عباس علی وفایی: زیر نظر شورای گسترش زبان و ادبیات فارسی، مرکز گسترش زبان و ادبیات فارسی، انتشارات میراثبان، (مقالہ: موقعیت زبان و ادبیات فارسی در پاکستان و چالش ہا، مہر نور محمد خان)

(۲) شناخت نامہ گروہ زبان و ادبیات فارسی، دانشگاہ نمل، اسلام آباد۔

(۳) کتابخانہ نذیر، دانشگاہ نمل، سیکتر ایچ ۔۹، اسلام آباد

(۴) اتاق ایران، بخش فارسی، دانشگاہ نمل، سیکتر ایچ ۔۹، اسلام آباد

(۵) کتابخانہ گنج بخش، مرکز تحقیقات فارسی ایران پاکستان، اسلام آباد

چشم بینش

دبیر کے اس کالم میں مسلسل فارسی زبان وادبیات کے متعلق جدید مطبوعات کا تعارف پیش کیا جاتا ہے مقصد فقط یہ ہے کہ جن حضرات کو ان مطبوعات کا علم نہیں وہ اس سے آشنا بھی ہوسکیں اور اپنی علمی وادبی سرگرمیوں کے اعتبار سے مستفیض بھی ہوسکیں اس مرتبی عہد بابر وہمایوں کے نامور ادباء وشعراء پر مختصر تعارف پیش کیا جارہا ہے۔(مدیر)

عہد بابر وہمایوں کے نامور ادباء وشعراء: ایک تعارف

صحام محیط، ریسرچ اسکالر، شعبۂ فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

پیش نظر کتاب ''عہد بابر وہمایوں کے نامور ادباء وشعراء'' ڈاکٹر رعنا خورشید کی شاہکار تصنیف ہے۔ڈاکٹر رعنا خورشید علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے حلقہ علم وادب میں محتاج تعارف نہیں۔موصوفہ شعبۂ فارسی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ایسو سئیٹ پروفیسر کے عہدہ پر فائز ہیں اور تقریباً بیس سالوں سے مسلسل درس وتدریس کی خدمات انجام دے رہی ہیں۔علاوہ ازیں موصوفہ کے گراں بہا کارناموں میں ''گلہائے رعنا'' اور ''تذکرہ سیر العارفین کا تنقیدی جائزہ'' شامل ہیں اور زیور طبع سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آچکی ہیں۔موصوفہ کی مذکورہ تصانیف فارسی زبان وادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے آب حیات کی مانند حیثیت رکھتی ہیں۔اس کے علاوہ محترمہ کے اہم وپرمغز مقالات ملک کے مختلف رسائل وجرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں جس سے انکی صلاحیت وقابلیت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

اس سے پہلے کے مذکورہ بالا تصنیف کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالی جائے۔عہد بابر وہمایوں کے محیط ادبیات فارسی پر مختصراً غور وفکر کرنا لازم وملزوم ہے۔خاندان مغلیہ کا بانی ظہیر الدین محمد بابر بادشاہ تاجدار سلطنت ہندوستان ہونے کے ساتھ ساتھ آسمان ادب کا ایک درخشندہ ستارہ بھی تھا۔اسکی شخصیت مختلف اوصاف اور قابلیت کا مخزن تھی۔وہ بلند پایہ شاعر، ادیب، سخن شناس اور علم پرور تھا۔اس کو ترکی اور فارسی دونوں زبانوں پر یکساں مہارت حاصل تھی۔جسکی زندہ وجاوید مثال توزک بابری (بابر نامہ) ہے۔بابر بادشاہ کی طرح اس کا جانشین فرزند ارجمند نصیر الدین محمد ہمایوں بادشاہ بھی اپنے باپ کی طرح صاحب علم ودانش تھا۔وہ ایک عظیم شاعر اور ماہر علم ریاضی، نجوم وہیت تھا۔گرچہ اسکی ساری زندگی نامساعد حالات اور خانگی معاملات کو درست کرنے میں صرف ہوئی مگر فرصت کے اوقات میں شعروشاعری کا مشغلہ جاری رکھا۔علم وادب سے اسے اس قدر دلبستگی تھی کہ جلاوطنی کے عالم میں جبکہ بے تخت وتاج ادھر ادھر بھٹک رہا تھا اس وقت بھی رخت سفر میں کچھ کتابیں شامل تھیں اور فارغ الاوقات میں ان کا مطالعہ کیا کرتا تھا۔اسکی ذہنی فراست، قوت تخیل اور عقل کی

بلند پروازی کا جیتا جاگتا نمونہ اسکے اشعار کا وہ دیوان ہے جو''دیوان ہمایوں'' کے نام سے قلمی نسخہ کی شکل میں خدابخش لائبریری پٹنہ بہار میں موجود ہے۔جس کو ہادی حسن صاحب نوراللہ مرقدہ نے تصحیح کر کے شائع کیا ہے۔

مختصر یہ کہ مغل شہنشاہ نہ صرف خود صاحب قلم تھے بلکہ وہ اپنے دور کے علماء،فضلاء ادباء اور شعراء کی دل کھول کر سرپرستی بھی کیا کرتے تھے۔جسکے نتیجہ میں ان کا دربار بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں کا مرکز بن گیا تھا۔اور یہ اہل علم وادب اپنی گوناگوں صلاحیت اور قابلیت کی بنیاد پر فارسی ادبیات کو سدرۃ المنتہی کی رفعت و بلندی تک پہچانے میں کامیاب وکامران رہے۔''عہد بابر و ہمایوں کے نامور ادباء وشعراء'' جیسا کہ اسکے عنوان سے عیاں ہے کہ اس کتاب میں بابر و ہمایوں کے عہد کے وہ نامور ادباوشعرا مورد بحث ہیں جو اس مخصوص زمانے یا ان دونوں علم پرور بادشاہوں کے دربار سے براہ راست یا بالواسطہ منسلک رہے ہیں اور کافی شہرت کے حامل ہیں۔جن میں گلبدن بیگم،بایزید بیات، جوہر آفتابچی، بیرم خاں اور قاسم کاہی وغیرہ سرفہرست ہیں۔یہ کتاب ۲۰۱۱ء میں لیتھوکلر پرنٹرس،اچال تال،علی گڑھ سے شائع ہوکر منظر عام پر آچکی ہے۔اور یہ کتاب پیش لفظ اور مقدمہ کے علاوہ ۱۶۹ر صفحات پر مشتمل ہے۔مصنفہ نے اپنی اس تصنیف کو دو فصلوں میں منقسم کیا ہے۔فصل اول میں ادباء اور انکے کارنامے،فصل دوم میں شعراء اور ان کے کلام کا ذکر ایجاز واختصار کے ساتھ قلم بند کیا ہے۔اس کتاب کے شروع میں پروفیسر آزرمی دخت صفوی،ڈائریکٹر مرکز تحقیقات فارسی نے پیش لفظ لکھ کر اس کی زیب و زینت میں اضافہ کیا ہے۔اس کے علاوہ چھ صفحات پر متحوی مصنفہ نے پر مغز مقدمہ لکھا ہے۔مقدمہ میں ہندوستان میں فارسی زبان وادب کی ابتداء اور اسکی ترویج وترقی پر مختصر روشنی ڈالی ہے۔بعدازاں عہد مغلیہ کے فارسی زبان وادب کی صورت حال پر مختصراً خامہ فرسائی کی ہے۔کتاب کے اخیر میں مصنفہ نے بطور کتابیات ان اکیاسی (۸۱) نسخہ ہائی خطی،کتابہائی مطبوعہ اور انگریزی تصانیف کا بھی ذکر کیا ہے جن سے اس کتاب کی تالیف میں براہ راست استفادہ کیا ہے۔آخراً میں بارگاہ خداوندی میں دعا گو ہوں کہ اللہ تعالی مؤلفہ کو صحت کاملہ،دائمہ اور مستمرّہ عطا فرمائے!!!اور ہم مؤلفہ سے آئیندہ بھی پرامید ہیں کہ ہماری گراں بہا تاریخ کے فراموش شدہ علمی وادبی وراثت پر خامہ فرسائی کر کے ہم تشنگان علم کے لئے شاہ راہ نو قایم کریں گی۔اخیر میں مولفہ کی خدمت میں فردوسؔی کا وہ مشہور ومعروف شعر پیش کرنا چاہتی ہوں جس میں فردوسؔی نے علم ودانش کی ارزش واہمیت سے زمانے کو خبردار کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے اور علم وعقل کو دنیا کی سب سے بڑی نعمت گردانا ہے۔

توانا بود ہر کہ دانا بود زدانش دل پیر بر نا بود

ملنے کا پتہ:۔
(ڈاکٹر رعنا خورشید،یونانی کالونی،مقابل ریڈیو کالونی،انوپ شہر روڈ،علی گڑھ)

Quaterly Literary Research Journal ISSN- 2394-5567

DABEER

(An International Peer Reviewed Refereed Research Journal
For Persian Literature)

VOLUME:- II **ISSUE:- IV**

October to December 2015

Editor:
Ahmad Naved Yasir Azlan Hyder

Address:
Dabeer Hasan Memorial Liberary ,12, Choudhari, Mohalla,
Kakori, Lucknow, U.P., India-226101
Email:- **dabeerpersian@rediffmail.com**

Mob. no:- 09410478973

Founder:- **Professsor Umar Kamaluddin Kakorvi,** LU, Lucknow.

Chief Supervisor:- **Dr. S. M. Asghar Abidi**, AMU, Aligarh.

Supervisor:- **Dr. Anjuman Bano Siddiqui,** Lucknow.

Editorial Board

Professor Syed Hasan Abbas, BHU,

Professor S M A Khursheed, AMU,

Professor Aleem Asharaf Khan, DU,

Dr. Shahid Naukhez Azmi, MANUU,

Dr. Muhammad Aqeel, Persian, BHU,

Dr. Muhammad Qamar Alam, AMU,

Zunnoorain Haider Alavi, Editor

Bi-Annual **TASFIYA**, Kakori, Lucknow.

Naqi Abbas Kaifi, Editor

Quaterly **NAQD-O-TAHQEEQ**, Delhi.

Arman Ahmad, Editor

Quaterly **IRFAN**, Chapra, Bihar.

Co-Editors

Mohammad tauseef, AMU, Aligarh

Atifa Jamal, Lucknow

Munazir Haque, AMU, Aligarh

Muhammad Hasan, AMU.

Muhammahd Anas, AMU, Aligarh

Sarim Abbas, AMU, Aligarh

Asharf Ali, AMU, Aligarh

Rajesh Sarkar, BHU, Varanasi

Mohammad Jafar, JNU, Delhi

Saduddeen, AMU, Aligarh

Review Comiitee

Professor Azarmi Dukht Safavi,

Director IPR, AMU, ALigarh.

Professor Shareef Hussain Qasmi,, Ex-Dean,

F/0 Arts, DU, Delhi,

Professor Mohammad Iqbal Shahid , Dean

F/o Laguages Islamic & Ori. Lear. , GCU, L.

Prof. Abu Musa Muhammad Arif Billah,

Al Biruni Faundation, Dhaka.

Professor Abdul Qadir Jafery,

HOD Arbic & Persian, A. University.

Dr. Najm ul Rasheed, Persian,

Punjab University, Lahore.

Advisory Board

Professor Ziyauddin Ahmad Shakeb Kakorvi,

Professor Panna Lal, HOD History,AU

Professor Ram Sumer Yadav, Lucknow

Professor Musheer Hussain Siddiqui, LU

Dr. Gulfihsa Khan, AMU

Dr, Ata Khursheed, MA Liberary, AMU

Dr. Pradeep Jain, Allahabad.

Dr.(Ms.) Berna Karagözoglu, Agri Ibrahim

Çeçen University, Turkey.

Dr. Iftikhar Ahmad, M A College, Colcata.

Dr. Alam Azmi, KMCUAFU, Lucknow.

Dr. Arshad Qadiri, Lucknow University,

Dr. Sakina Khan, HOD Persian, MU,

Dr. Shahram Sarmadi, Tehran, Iran.

Dr. Prashant Keshavmurthy, Macgill Univ.

Inci Celikel, Anatoliya Univerity, Turky.

Index

1- Mughal Ladies and their Contribution to Persian Language, Literature and Culture. By Qaiser Ahmad 4

2- A Brief Survay of Socio-Cultural condition of modern Iran. By Sk. Kutubuddin 9

3- Hamidullah Kashmiri (Hamid)-A Great Poet of Kashmir. By Waseem Raja Butt 23

4- Tarikh-i-Azmi: A Book of History and Tazkira By Munish Kumar 31

5- Role of Syed Ali Hamdani to propagate Islam and Persian Language and Literature in Subcontinent and Specially in Kashmir. By Mumtaz Ahmad 36

MUGHAL LADIES AND THEIR CONTRIBUTION TO PERSIAN LANGUAGE, LITERATURE AND CULTURE

Dr. Qaiser Ahmad
Asst. Professor, Department of Persian, MANUU, Hyderabad

India is a country which is loved not only by its indigenous people but also loved by the foreigners, migrants, rulers and invaders. Many of them made India as their home-country and got influenced by the culture, tradition, food, dress and languages of the people of India. Many of them also influenced the people of India by their own culture, language and traditions and hence contributed to the composite culture of India.

The Mughals were also one of them. The Mughal period in India is famous for its rule, administration, agrarian system, economic policies, art, architecture and culture. Not only the emperors but the ladies of Mughal Harem were also among the front runners, who have contributed in many ways. These ladies apart from establishing monuments and schools (madarsas) also nurtured the society and promoted art and culture in the country. Most of the princesses were educated and true patrons of art, culture and literature. Although there were many ladies of the Royal Harem who have contributed in Persian literature but the focus had always been only on three ladies who have their works in Persian Language.

Babur's daughter, Humayun's sister and Akbar's aunt, Gulbadan Begum was the first princess of the Mughal Empire. She was born in 1523 AD in Kabul. She got her education in Kabul and at the age of sixteen she was married to Khizra Khan. After performing the Hajj pilgrimage she spent her last days in Agra and died in 1653 AD at the age of eighty. Akbar used to consult her on many political and administrative issues.She acquired education and had command over Persian and Arabic languages. She was a patron of knowledge and used to encourage poets and writers. She was witness to the rise and fall of Babur and Humayun. She was a poet too and had a Diwan to her credit but it is lost now.

Gulbadan Begum started writing the events occurred during the period of Babur and Humayun on the request of Akbar. Her book "Humayun Nama" is based upon historical events. Most of the events mentioned in Humayun Nama were witnessed by her. This book, apart from having literary importance is also a great source of history and is considered as the only source of history about Humayun's five years wanderings after the defeat at the hands of Sher Shah.

The second famous princess was Jahan Ara, who was the eldest child of Shah Jahan and Mumtaz Begum. She was born in 1614 AD in Ajmer. She learnt Quran and had command over the languages of Persian and Arabic. After the death of her mother in 1631 AD she had to execute a lot of responsibilities.

When Aurangzeb revolted against his father, Shah Jahan, and put him under house arrest she chose to remain with her father to serve him in his older days. Like many Mughal ladies she too had influence in politics. She used to patronize poets, writers and historians. She built some monuments and gardens. In 1948 she built a mosque in Agra at the expenditure of five lacs rupees. She built a Madarsa, a Buddhist monastery in Agra and also built some night shelters in different cities. She built a water reservoir in Delhi and a separate guest house was built for foreigners, which was known as Begum Sarais. Unfortunately this Sarai was damaged in the 1857 revolution.

Jahan Ara shifted to Delhi after the death of her father. She died fourteen years after the death of Shah Jahan. As per her wish she was buried near the tomb of Nizamuddin Aulia in Delhi. She had a close attachment with Sufism and wrote a book on the sufis and saints of India named as "Monis-ul-Arwah" at the early age of twenty six in 1640 AD. The book is on the lives and teachings of the Sufis like Moinuddin Chishti, Nizamuddin Aulia, Shiekh Hamiduddin Nagori, Qutbuddin Kaki, Ganj Shekar etc. Like her brother, Dara Shikoh, she was influenced with the philosophy of Sufism. Apart from being a prose writer she was also a poetess. She has recited some couplets in Monis-ul-Arwah and has praised the Almighty in her couplets (Hamd) and has also written Marsia on the death of her father.

Last but not the least to be mentioned here is Zebunnisa, who was the eldest daughter of Aurangzeb. She was born in 1639 AD at Daulatabad, Deccan. She learnt Quran and became Hafiz at the early age of seven. She had keen interest in Persian, Arabic, Mathematics, astrology and music. She started writing Persian poetry at an early age and persuaded her father Aurangzeb to allow her to visit the whole country and Iran to select and invite poets and scholars to form an Academy in Delhi. In her personal court there was an academy where writers, poets and scholars were engaged in academic and literary activities. Many books got translated in this academy. The name of every book used to be started with "Zeb". Aurangzeb played an important role in establishing this academy. It was an exception since he stopped patronizing the poets.

In the court of Zebunnisa, there was sometimes conduction of Mushairas in which many renowned poets of the period used to participate. She used to get four lacs rupees annually from her father, which she mostly used on the patronage of art, language and culture. She built a library where apart from collecting books calligraphers were employed to write the important and precious books. She died in 1701 AD in Delhi and was buried in Tees Hazari, Delhi. Although there is a controversy over the book Diwan-e-Makhfi, twenty three years after her death her book was introduced. Few scholars claimed that it was the book of a poet who came from Khurasan during Shah Jahan's period (1). The first fifty Ghazals of this book were translated into English by Jessie Duncan Westbrook and Magan Lal and was published in the Wisdom of the East Series named as Diwan-e-Zebunnisa. The introduction in the book by Jessie Duncan Westbrook throws light on the life and works of Zebunnisa. There are almost Five Thousand couplets in Diwan-e-Makhfi, which consists of Ghazals, Qasidas, Rubais, Hamd and Naat.

Highlights of Their Works: In her book Gulbadan Begum has written the lives of the emperors and the situation in which they ruled. She focused on the people's lives, society and culture and also gives valuable information about women. Like, their upbringing and education and their participation in

day to day's life. According to Gulbadan Begum, women were expert in archery, polo and music. She says that women used to ride horses for travel and used to hunt and participate in the wars and also dressed like men (2).

From the ancient times India is famous for handicrafts. The people of India were fond of decorating their houses. Gulbadan Begum informs that during the Mughal period people used handicrafts material, silk and embroidery to decorate their houses. She says that the cities of Agra, Gwalior, Sikri, Lahore and Benaras were very famous and the prices in the markets were cheaper. The ladies of Harem also used to visit these cities (3).

When Humayun was defeated by Sher Shah, he along with his family members took shelter in Iran and Shah Tahmasap helped them. Gulbadan Begum points out that on many occasions Humayun, in conversation with Shah Tahmasap, referred India as bigger and better than Iran (4). He stressed that the Indian goods were better than those of the Iranians. She informs that the decoration of the market and houses started in India during Humayun's period. She, however, informs that it was not only Indian art that was prevalent in India, the European art also made significant presence.

On some other instances Gulbadan Begum mentions about the Indian rivers and the bridges over them. She says during that period there were many wells in India and many of them were very close to each other. But on many places it was hard to find a well to drink water even after the journey of many hours. It was difficult for the people to live there. She also highlighted the people's belief in astronomy. Before starting any work the people used to know the auspicious and appropriate time for that by knowing the situation of the stars.

Like many of their male counterparts the ladies of Mughal Harem also had deep faith in Sufism. Jahan Ara not only had faith but also wrote a book on the lives and teachings of the famous Sufis of India, named as Monis-ul-Arwah. In fact this book reveals her faith in Sufism. Introducing the city of Ajmer Jahan Ara says that "Aja" was the name of a king who had his territory till Ghaznin and it also means the "Sun" and the meaning for "Mer" is mountain in Hindi language. She says that the first wall on any mountain in

India was built on the mountains of Ajmer and the first water reservoir was built in Pushkar near Ajmer.

Zebunnisa too had inclination towards Sufism. She was very much influenced by her uncle, Dara Shikoh, who was a great scholar, writer and a secular prince. He has translated many Hindu religious books into Persian with the help of pundits. He wrote a book "Majma-ul-Bahrain", in which he tried to synthesize the philosophies of Hinduism and Islam. One can find the same philosophy prevalent in the poetry of Zebunnisa. She dreamt of a society where everybody lived in peace and harmony. She used the pen name as "Makhfi" the hidden one. She was in the opinion that people should not fight against each other on the religious issues and had a deep faith in composite culture. She did not see any difference among the religions. Though she was the daughter of an emperor but she was very simple because of her faith in Sufism.

In spite of the fact that they lived in Harem but the voices of the Mughal ladies were not restricted to the walls of the fort. They were in veil but their services to the society were not hidden. They played important role in many fields and contributed to the formation of society where everyone was equal and united with each other. The ladies of Mughal Harem through their writings urge the people not to fight each other on petty religious issues and to live in peace and harmony.

References:

1. Zebunnisa Aur Diwan-e-Makhfi(article): Mahfuz-al-Haque, Maarif, Vol. 1, May'1923.
2. Humayun Nama: Gulbadan Begum; Page-32.
3. History of Humayun Nama: Gulbadan Begum; Translated by Annette S. Beveridge, Low Price publication, Delhi-1902, Page-30.
4. Ibid, Page-69.

A Brief survey of socio-cultural condition of modern Iran

Sk. Kutubuddin (Researh Scholar)‹Deptt.of Arabic, Persian, Urdu & Islamic Studies,Visva-Bharati University, West-Bengal,

The terms Iran as the designation for the civilization, and Iranian as the name for the inhabitants occupying the large plateau located between the Caspian sea and the Persian Gulf have been in succeeding gradually use for more than twenty-five hundred years. They are related to the term Aryan and it is supposed that the plateau was occupied in prehistoric times by indo-European peoples from central Asia through many invasions and changes of empire, this essential designation has remained a strong identifying marker for all populations living in this region and the many neighbouring territories that fell under its influence due to conquest and expansion.

Ancient Greek geographers designated the territory as Persia after the territory of Fars where the ancient Archamenian Empire had its seat. Today as a result of Migration and conquest, people of Indo-European, Turkic, Arab, and Caucasian origin have some claim to Iranian culture identity. Many of these peoples reside within the Territory of Modern Iran. Outside of Iran, those identifying with the larger civilization often prefer the distinction Persian to indicate their rapport with the culture rather than with the modern political state. This is also true of some members of modern Iranian émigré populations in the United States, Europe, and elsewhere who do not wish to be identified with the current Islamic Republic of Iran, established in 1979.

Iran and ancient Persia have a long, creative and glorious history. Unlike many other Middle East countries, Iran managed to remain independent throughout much of its history. Today, Iran has a population of about 70 million persons. Principle ethnic groups are Persian 51%, Azeri 24%, Gilaki and Mazandarani 8%, Kurd 7% and Arab 3%. Iran is a Muslim country, with 89% Shi'a and 10% Sunni Muslims. The remaining 1% belong to Jewish, Bahai and Zoroastrian faiths. The Bahai and Zoroastrian faiths originated in

Iran. Major Languages of Iran are Persian (Fars) and Persian dialects 58%, Turkic and Turkic dialects 26%, Kurdish 9%, Luri 2%, Baluchi 1%, Arabic 1%, Turkish 1%. Since 1979, Iran is an Islamic Republic.

Persianate society is a society is a society that is either based on, or strongly influenced by the Persian language, culture, literature, art and identity. The term Persianate is a neologism credited to Marshall Hodgson. In this 1974 book, the venture of Islam: The expansion of Islam in the middle periods, he defined it in these words.

"The rise of Persian had more than purely literary consequence: It served to carry a new overall cultural orientation within Islam dom…. Most of the more local languages of high culture that later emerged among Muslims…Depended upon Persian wholly or in part for their prime literary inspiration. We may call all these cultural Traditions, carried in Persian or reflecting Persian inspiration, 'Persianate' by extension."[1]

The term, consequently, does not solely designate ethnic Persians, but has been ethnically Persian or Iranian, but whose linguistic, material or artistic cultural activities were influenced by or based on Persianate culture. Example of pre-19th century Persianate societies were the Seljuq, Timurid, Otttoman dynasties, as well as the Qarmations who entertained Persianate notions of cyclical time even though they did not invoke the Iranian genealogies in which these precepts had converged. Persianate is a multiracial cultural category, but it appears at times to be a religious category of a racial origin.[2]

Persianate culture, particularly among the elite classes, spread across the territories of western, central, and south Asia, although populations across this vast region had conflicting allegiances (sectarian, local, tribal, and ethnic affiliation) and spoke many different languages. It was spread by poets, artists, architects, artisans, jurists, and scholars, who maintained relations among their peers in the far-flung cities of the Persianate world, from Anatolia to India.[3]

Persianate culture involved modes of consciousness, ethos, and religious practices that have persisted in the Iranian world against hegemonic Arab Muslim (Sunni) cultural constructs. This formed a calcified Persianate structure of thought and experience of the sacred, entrenched for generations,

which later informed history, historical memory, and identity among Alid loyalists and heterodox groups labeled by sharia-minded authority as ghul?t. In a way, along with investing the notion of heteroglossia, Persianate culture continuities and disjunction with the Iranian past and ways in which this past blended with the Islamic present or became transmuted. The historical change was largely on the basis of a binary model: a dualist struggle between the religious landscapes of late Iranian antiquity and a monotheist paradigm provided by the new religion, Islam.

Following the interregnum and anarchy of the eighteenth century, Iran was politically re-united under the Qajar dynasty (1794-1925). The Qajar period marked Iran's long and at times bloody transition from a traditional kingdom - where the existence of semi-independent magnates limited political unity - to a socially and politically integrated nation-state. The centralization of power during the Qajar period was the major impetus for the modernization of the military, the administration, education, and medicine.

Here one should distinguish between Modrnity and modernization. Modernity is the long and deep process of profound change in culture and values; a "traditional" society`s progress on the path troden by the Europeans in the five centuries since the Renaissance. Modernity implies a new world view based on rationalism, secularism, and humanism. By modernization we mean a new way of organising life and society; the process of bringing the institutions and infrastroctures that have been mainly devoloped in the West, through the process of Modernity, to a traditional and, by definition, backward society.

The Iranian modernizers in their search for applicapable models looked to Turkey and later Japan. What was happening in the Arab world seemed irrelevent to their conditions. The Arabs were not indepent - as Iran had at least nominally remained even in its darkest hours. Japan would seem a perfect model but for the fact that it was far away and nobody knew much about it. Turkey proved a more practical example.

Iran's wildlife is composed of several animal species including bears, gazelles, wild pigs, wolves, jackals, panthers, Eurasian Lynx, and foxes.

Domestic animals include, sheep, goats, cattle, horses, water buffalo, donkeys, and camels. The pheasant, partridge, stork, eagles and falcon are also native to Iran.

One of the most famous members of Iranian wildlife is the critically endangered Asiatic cheetah, also known as the Iranian Cheetah, whose numbers were greatly reduced after the Iranian Revolution. Today there are ongoing efforts to increase its population and introduce it back in India. Iran had lost all its Asiatic Lion and the now extinct Caspian Tigers by the earlier part of the 20th century.

The culture of Iran is a mix of ancient pre-Islamic culture and Islamic culture. Iranian culture has long been a predominant culture of the region, with Persian considered the language of intellectuals during much of the 2nd millennium, and the language of religion and the populace before that.

Iranian culture is Class based, traditional and patriarchal. Tradition for most is rooted in religion and class and patriarchy have been constant features of Iranian society since ancient times. Class in its simplest form is mainly based on income and financial status or family genealogy, though modernity and traditionalism might also be used to distinguish classes. In Iran different classes are bounded together through different processes and have different cultures. For example kinship is a primary source of security and financial support for low-income families. While with the affluent kinship is a source of emotional and psychological support and welfare. Division of labor could be a relatively simple division between the public (men's work) and domestic (women's work) for the poor and/or uneducated, or a technical division in sophisticated work environments for highly trained and educated professional males and females. Generally the lower and uneducated classes may regard females as inferior or different who are entitled to a lesser position in the society. On the other hand the modern classes normally strive to guarantee the equality of sexes and eliminate gender discrimination.

Tradition is mostly based on religion particularly Islam and its' prescribed codes of behavior, however it contains elements that are much older. For example the prominent position allocated to family as reflected in

the Islamic sources and legal codes is a continuation of universal practices adopted by most Eastern societies since ancient times. What makes a difference with respect to Islam is the belief held by many Muslims that "Islam is a body of values, ideas and beliefs that should encompass all spheres of life, including personal and social relationships, economics and politics". Consequently for the traditional practicing Muslim the only accepted relationship between the sexes may be through marriage or concubines. The two are the only forms legitimized by Shiite Islam. For such families there may be no question of males and females openly dating or socializing with such intentions before they are legally bounded through the prescribed unions (e.g. arranged marriages). In such cases what is usually classified as group behavior could also be identified with religious behavior. Separating the two might become a daunting task for outsiders not familiar with the intricacies of the traditional and or Muslim culture.

Iranian culture is adult oriented with parents being involved in making major decisions for their children such as, whom they should marry and what profession they should have. Nevertheless children are very loved and are the priority with most families. Education is highly praised amongst all Iranians and quite often children are pressured to succeed academically. Mothers and recently fathers spent lots of time with their children and if they can afford it they will financially support them all the way till they have finished all their education and beyond. It is quite expected with the rich to buy property and expensive cars for their children and provide them with a good life style from an early age. Children on the other hand are expected to trust and respect their parents and follow the guidelines designed for them. Family traditionally comes before the individual and family members are brought up and expected to understand and respect such notions.

Iranian culture is patriarchal, legally and culturally males have more rights and privileges than females. Centuries of gender discrimination and segregation of sexes has created distinct roles and codes of behavior for both the sexes and many are still practiced today. Many women particularly the older generation feel more comfortable being with other women rather than in

mixed company even though most do not practice segregation of sexes. Parents normally have double standards concerning their children. Usually, there are more restrictions for girls compared to boys with respect to individual freedoms, dress codes and association with the opposite sex. Virgin brides are still in demand by many Iranian males and their families, while there is little stigma attached to males having girl friends and sexual relationships while single.

The Sassanid era was an important and influential historical period in Iran as Iranian culture influenced China, India and Roman civilization considerably, and so influenced as far as Western Europe and Africa. This influence played a prominent role in the formation of both Asiatic and European medieval art. This influence carried forward to the Islamic world. Much of what later became known as Islamic learning, such as philology, literature, jurisprudence, philosophy, medicine, architecture and the sciences were based on some of the practises taken from the Sassanid Persians to the broader Muslim world.

Since the Islamization of Iran, Islamic rituals have penetrated the Iranian culture. The most noticeable of them is the commemoration of Husayn ibn Ali: every year on the Day of Ashura, most Iranians, including Armenians and Zoroastrians, participate in mourning for the martyrs of the battle of Karbala. Daily life in modern Iran is closely interwoven with Shia Islam and the country's art, literature, and architecture are an ever-present reminder of its deep national tradition and of a broader literary culture.

Parsi or Persian was the language of the Parsa people who ruled Iran between 550 - 330 BCE. It belongs to what scholars call the Indo-Iranian group of languages. It became the language of the Persian Empire and was widely spoken in the ancient days ranging from the borders of India in the east, Russian in the north, the southern shores of the Persian Gulf to Egypt and the Mediterranean in the west.

Over the centuries Parsi has changed to its modern form and today Persian is spoken primarily in Iran, Afghanistan, Tajikistan and parts of Uzbekistan. It was the language of the court of many of the Indian kings till

the British banned its use, after occupying India in the 18 century. The Mogul kings of India had made Persian their court language. Engraved and filled with gold on walls of Delhi's Red Fort is the sentence "Agar Ferdows dar jahan ast hamin ast o hamin ast o hamin ast"; - 'If there is a paradise on earth it is here it is here it is here.'

About half of the people of Iran live in small farm villages. Most of these villages nestle in the mountains, particularly in western and northern Iran. Most of the farmers live in country villages.These villages usually consists of a single wide steet and many narrow, twisting, unpaved lanes lined with gray-walled houses. Small mosques usually stand on the village square. Few of them have schools or stores. Dr. Md. Faique says about village system:

"The village groups formed an important element in traditional Persian society.In early times, prior to the Arab invasion, Persian settlements generally consisted of small scattered agricultural hamlets which formed a part of a large feudal estate.With each new conquest of iran, the rulers paid their military and eivilian officials with large grants of land. The new landholders dominated but did not remove the existing landowing class. A hierarchy of landowners emerged and the peasants generally became the losers. One village had so little contact with another that two neighbouring communities frequently spoke different dialects. Strangers aroused suspicion and threatened their security, what little they had. A strong wall around the village afforded some means of protection from outsiders but it also kept out news of the world at large. Muharram, the period of religios mourning, kindled group emotions, the high point came with performance of the Taziyeh, a kind of passion play. The occasion gave the villagers an opportunity to project their own feelings of sorrow and suppression into the personages of the martyred Saints."[4]

Most of the cities lie in the western part of the country, near mountains. Fewer than 20 Iranian Cities have more than 100,000 persons. The mud-brick houses and mosques with their tall minarets (Tower) make the cities look much different from those in North America. The gray walls of houses give the cities a drab, dull appearance. But new schools, hospitals,

apartment buildings and government buildings stand along wide, tree-lined boulevards in the few modern sections. Most of the cities originally were resting places for Camel Caravans, or served as trading or religious Centres.

Merchants sell their goods in little shops along the narrow streets of the crowded Bazars (Market places). Dorned brick roofs over some of the streets of the bazars protect the merchants and customers from sun and rain. The modern sections have stores similar to those in North America.

Iranian philosophy or Persian philosophy can be traced back as far as to Old Iranian philosophical traditions and thoughts which originated in ancient Indo-Iranian roots and were considerably influenced by Zarathustra's teachings. According to the Oxford Dictionary of Philosophy, the chronology of the subject and science of philosophy starts with the Indo-Iranians, dating this event to 1500 BC. The Oxford dictionary also states, "Zarathushtra's philosophy entered to influence Western tradition through Judaism, and therefore on Middle Platonism."

Throughout Iranian history and due to remarkable political and social changes such as the Arab and Mongol invasions of Persia, a wide spectrum of schools of thoughts showed a variety of views on philosophical questions extending from Old Iranian and mainly Zoroastrianism-related traditions, to schools appearing in the late pre-Islamic era such as Manicheism and Mazdakism as well as various post-Islamic schools. Iranian philosophy after Arab invasion of Persia, is characterized by different interactions with the Old Iranian philosophy, the Greek philosophy and with the development of Islamic philosophy. The Illumination School and theTranscendent Philosophy are regarded as two of the main philosophical traditions of that era in Persia.

Philosophy was and still is a popular subject of study in Iran. Previous to Western style universities, philosophy was a major field of study in religious seminaries. Comparing the number of philosophy books currently published in Iran with that in other countries, Iran possibly ranks first in this field but it is definitely on top in terms of publishing philosophy books.

On the diversity and expansion of philosophy in Iran, Khosrow Bagheri has stated "One part of philosophical endeavor in Iran today, and

perhaps the main one, is concerned with the local philosophy which is dominated by the school of Mulla Sadra. He has provided a philosophy in line with the old metaphysical inclination but in the feature of a combination of mysticism, philosophy, and the Islamic religious views. On the other hand, a relatively strong translation movement has been shaped in which the Iranian readers are provided by some of the important sources of contemporary philosophy in Persian including both the analytic and continental traditions. In the former, Wittgenstein, Searle, and Kripke, and in the latter, Nietzsche, Heidegger, and Foucault can be mentioned. There have also been concentrations on a local polar contrast between Popper and Heidegger, and, due to the religious atmosphere, on philosophy of religion." [5]

Among journals being published in Iran on philosophy there are FALSAFEH-The Iranian Journal of Philosophy published by the department of philosophy of the University of Tehran since 1972 and Hikmat va Falsafeh published by Allamah Tabataba'i University in Tehran, Ma'rifat-e Falsafeh published by the Imam Khomeini Education and Research Institute in Qom, and many others. Also worthy of mention is the journal, Naqd o Nazar published by Daftar Tablighat in Qom, which often includes articles on philosophical topics and other issues of interest to religious thinkers and intellectuals. It is important to note that Sufism has had a great amount of influence on Iranian/Persian philosophy.

Iranian philosophy after the acceptance of Islam in Persia, is characterized by different interactions with the Ancient Iranian Philosophy, the Ancient Greek philosophy and with the development of Islamic philosophy. Illuminationism and transcendent theosophy are regarded as two of the main philosophical traditions of that era in Persia. Among important contributors to philosophy in Iran are Zoroaster, Jamasp, Mardan-Farrux Ohrmazddadan, Adurfarnbag Farroxzadan, Adurbad Emedan, Iranshahri, Farabi, Avicenna, Ali ibn Sahl Rabban al-Tabari, Suhrawardi, Nasir Khusraw, Biruni, Muhammad ibn Zakariya al-Razi, Abu Yaqub al-Sijistani, Nasir al-Din Tusi, Qutb al-Din Shirazi, Mir Damad, Mulla Sadra, Mir Fendereski and Hadi Sabzevari.

According to the Iranian government, around 90% of Iranians associate themselves with the Shi'a branch of Islam, the official state religion, and about 9% with the Sunni and Sufi branches of Islam. The remaining 0.9% associate themselves with non-Islamic religious minorities, including Bahá'ís, Mandeans, Yarsanis, Zoroastrians, Jews, and Christians. The latter three minority religions are officially recognized and protected, and have reserved seats in the Iran parliament. Zoroastrianism was once the majority religion, though today Zoroastrians number only in the tens of thousands. Iran is home to the second largest Jewish community in the Muslim World. TheBahá'í Faith, Iran's largest non-Muslim religious minority, is not officially recognized, and has been persecuted during its existence in Iran.The Iranian government does not officially recognise the existence of non-religious Iranians. This leaves the true representation of the religious split in Iran unknown as all non-religious, spiritual, atheist, agnostic and converts away from Islam are likely to be included within the government statistic of the 99% Muslim majority. Sunnism was the predominant form theology before the devastating Mongol conquest, but subsequently Shi'ism became dominant.

Iran is an Islamic republic. Its constitution mandates that the official religion is Islam (see: Islam in Iran), specifically the Twelver Ja'fari school of Islam, with other Islamic schools being accorded full respect. Followers of all Islamic schools are free to act in accordance with their own jurisprudence in performing their religious rites. The constitution recognizesZoroastrian, Jewish, and Christian Iranians as religious minorities.

Complaints about religious freedom in Iran revolve around the persecution of the Bahá'í Faith, unequal rights of non-Muslim religions, and the forbidding of conversion from Islam to other religions. The Bahá'í Faith is not recognized and is claimed by some to be persecuted. There have been reports of imprisonment, harassment, intimidation, discrimination, and murder based on religious beliefs.[6]

Hudud statutes grant different punishments to Muslims and non-Muslims for the same crime. In the case of adultery, for example, a Muslim man who is convicted of committing adultery with a Muslim woman

receives 100 lashes; the sentence for a non-Muslim man convicted of adultery with a Muslim woman is death. In 2004, inequality of "blood money" (diyeh) was eliminated, and the amount paid by a perpetrator for the death or wounding a Christian, Jew, or Zoroastrian man, was made the same as that for a Muslim. However, the International Religious Freedom Report reports that Baha'is were not included in the provision and their blood is considered Mobah, (i.e. it can be spilled with impunity).

Most of the farms lie in the northern, southern and western parts of the country, where there is enough water to irrigate the crops.Many Iranian farmer own their own land. During the 1950, the Shah sold muh of his land at low cost to the farmers. During the 1960, as part of a land reform program, the government bought huge blocks of land from wealthy landowners. The government then sold small plots of this land to peasant farmers.

Most Iranian farmers use primitive methods to raise their crops. For example, many cultivate their land with wooden plows pulled by oxen. However, the government has introduced agricultural schools. A water shortage is Iran's greatest farming problem. Because of this lack of water, only about 15 percent of the country can be used to grow crops. The government has built few irrigation projects, because it lacks money. Most of the farmland is watered by the ancient Kanat system. This system consists of deep wells in the hills or mountain slopes, and long tunnels that carry the well water to the farmland. The wells and tunnels are dug by special workmen who come from families that have specialized in the construction of Kanat system for hundreds of years. These irrigation systems require much work to build and maintain.

In Traditional Islamic Persia, the 'Maktab', Madrasah and religious colleges, played an important role in education. Religious and moral Training were stressed. Even before entering school the child learned to pray and observe the family Tradition of performing the Ramzan fast and the Muharram mourning practices.

Having the world's youngest population, the Islamic Republic of Iran bears the responsibility of education more that 18 million students at

segregated schools. General education is free and parents are obliged to enroll their six years old children at schools. It comprises 5 years of primary, 3 years of lower secondary, 3 years of upper secondary and one year of pre-university of education. The language of instruction in Farsi.The first day of school year is 22 September (1st Mehr), which is annually celebrated joyfully.

"The most prevalent kind of elementary education in Traditional Iran was the system of Maktab-religious schools supported by private contributions and religious foundations and often associated with a mosque. The Maktab system was very limited in many ways. Its syllabus included such subjects as reading, writing and familiarity with the Qyran and classical Persian Texts like Saadi's Gulistan and Bustan and the poems of Hafiz."[7]

Persian wedding traditions, despite their local and regional variations, like many other rituals in Iran go back to the ancient Zoroastrian tradition. Though the concepts and theory of the marriage have been changed drastically by Islamic traditions, the actual ceremonies have remained more or less the same as they were originally in the ancient Zoroastrian culture. The Persian wedding traditions are observed by the majority of ethnic groups in Iran.

Persian drama has a unique place not only in the development of Persian literature but also in bringing about a revolutionary change in the socio-cultural history of Iran. Drama was successfully used as a vehicle to highlight socio-cultural and political trends of Iran.

The word 'drama' is derived from Greek word which means 'action' or 'thing done'. Drama is a performance of composition in prose or verse presening in dialogue or pantomime a story involving conflict or contrast of character. Drama is written for the Theatre, and the Theatre is a place where people come to see the actions as well as to hear the words. Drama plays an important role in making social and political history of the people. It is no exaggeration to say that ' nation is known by its Theatre'. As Donatus, a prominent critic expresses that " drama is a copy of life, mirror of custom, a reflection of truth".[8]

Historically, the single most important religious institution in Iran has been the mosque. In towns, congregational prayers, as well as prayers and rites

associated with religious observances and important phases in the lives of Muslims, took place in mosques. Iranian Shias before the Revolution did not generally attach great significance to institutionalization, however, and there was little emphasis on mosque attendance, even for the Friday congregational prayers. Mosques were primarily an urban phenomenon, and in most of the thousands of small villages there were no mosques. Mosques in the larger cities began to assume more important social roles during the 1970s; during the Revolution they played a prominent role in organizing people for the large demonstrations that took place in 1978 and 1979. Since that time their role has continued to expand, so that in 1987 mosques played important political and social roles as well as religious ones.

Nowruz:now means new and the word ruz means day, so nowruz means starting a new day and it is the Celebration of the start of spring ("Rejuvenation"). It starts on the first day of spring (also the first day of the Iranian Calendar year), 21 March, in that 12 days as a sign of the past 12 months, all Iranian families gather around and visit each other. It is also the best time to re-experience the feeling of mehr. In nowruz all families talk about their best experiences of the last year and the things they are looking forward in the next year and they all become bonded again in peace.

The musical culture of Persia, while distinct, is closely related to other musical systems of the West and Central Asia. It has also affinities to the music cultures of the Indian subcontinent, to a certain degree even to those of Africa, and, in the period after 1850 particularly, to that of Europe. Its history can be traced to some extent through these relationships. Like that of most of the world's cultures, the music of Persia has depended on oral/aural transmission and learning.

Iran throughout its history has been a melting pot for other cultures. Repeated introductions of new cultures through conquerors and traders from Aryan civilization until today have developed a kind of social subconscious filtration system which absorbs only the useful aspects of the frequently imposed, ever newer external cultures. This factor made it easier for Iran to adopt the western-originated cinema, in spite of Moslem religious beliefs that

opposed it. Yet, although superficially adaptable, deep down a majority of Iranians remain Persian, i.e. self-reliant individualists.

Persian art and architecture, works of art and structures produced in the region of Asia traditionally known as Persia and now called Iran. Bounded by fierce mountains and deserts, the high plateau of Iran has seen the flow of many migrations and the development of many cultures, all of which have added distinctive features to the many styles of Persian art and architecture. There are excellent collections of Persian art in Tehran; the Metropolitan Museum; the Museum of Fine Arts, Boston; and the Victoria and Albert Museum.

REFERENCES:

1. Hodgson 1974, pp. 293-294: Quote: "It could even be said that Islamicate civilization, historically, is divisible in the more central areas into an earlier 'caliphal' and a later 'Persianate' phase; with variants in the outlying regions-Maghrib, Sudanic lands, Southern Seas, India,(p. 294)"

2. Euben R. L., Enemy in the Mirror: Islamic Fundamentalism and the Limits of Modern Rationalism: A Work of Comparative Political Theory (Princeton, N.J.: Princeton University Press, 1999) p.54.

3. Hodgson, Marshall G. S. 1974. The Venture of Islam. 3 vols. Chicago: University of Chicago Press

4. Mohammad Faique; A complete study of Persian Drama (1906-1995), p.20-21

5. Interviews: Islam philosophy and education

6. Several important Baha'i shrines have been demolished, including the House of the Bab in Shiraz and a house belonging to the Baha'i prophet's family in Tehran. U.S. Department of State (2005-09-15). "International Religious Freedom Report 2006 - Iran". U.S. Department of State. Retrieved 2006-11-08.

7. Mohammad Faique; A complete study of Persian Drama (1906-1995), p.21-22

8. Nicoll, Allardyce; Theory of Drama, Draba House, Nai Sarak, Delhi-6,1974,p.24

Hamidullah Kashmiri (Hamid) A Great Poet of Kashmir

Waseem Raja Butt, Research Scholar,
Centre of Persian and west Asian Studies, JNU, New Delhi

The eighteenth and nineteenth century of Kashmir has seen the oppressive and ruthless reign of Afghans (1753-1819) and Sikhs (1819-1846) in the valley. The people of Kashmir have experienced great sufferings and hardships during these periods. There was a great loss to the patronage of Persian language and literature. The governors of these periods, except a few, were not interested in Persian. The Sikh governors totally didn't show their concern towards the Persian language and literature. Though the official language was Persian, they didn't pay any attention towards the development of Persian language and literature in Kashmir.

Due to the lack of patronage the Persian Language and literature lost its dignity and was on its way towards the decline. However the people of Kashmir didn't leave their talent unexpressed. A number of great poets and writers arose and served the Persian language and literature in such a way that they earned their name and fame for ever. Among these great poets and writers are Pt. Tika Ram Aakhun, Abdul Wahab Shayiq Khoyhami, Mulla Mohammad toufiq, Mulla Ashraf Dery Bulbul, Mulla Baha-ud-Din Mattu, Pt. Birbal Kachru warasteh, Baba Kamal-ud-Din and Mulla Hamidullah Shahabadi etc.

Hamidullah is one of the greatest poets and writers of nineteenth century whose fame has reached to Afghanistan. He has criticized the political situations of Sikh period in Kashmir in his book Napursan Nama (bibujnama).
Name and birth:

The full name of Hamidullah Kashmiri was Mohammad Hamidullah and he used Hamid as his pen name in his works. But in the public he is popularly known as Mulla Hamidullah Shahabdi. There is no detailed information regarding his Lineage except that he was born in the family of Moulavi Himayatullah at village Shahabad of block Brang, district Anantnag,

in Kashmir. Himayatullah was one of the scholars of Persian and Arabic language of his time and was engaged in teaching profession.

Date and year of birth of Hamidullah has not been mentioned in any biography (تذکرہ) however the historian Hasan has mentiond the year of his death as 1264 AH. Moreover Tikku also writes his year of birth as 1846 which is equal to 1246 AD. In none of the available sources has the duration of life lived by Hamid been mentioned. However when Hamid completed his Akbarnama in 1844 (equal to 1260 AD), he was very old and has expressed in Akbarnama as follows:

مکن بندۂ پیر خود نا امید   با این سستی سخت وریش سفید(5)

Thus from the above discussion it can be said that Hamidullah Kashmiri was born in the second half of the eighteenth century.

Education and profession:

During the eighteenth century, the period when Hamid was born, Persian language had been the official language of the Kashmir and people from each community, Hindus and Muslims, used to learn it. Therefore the scholars, the poets and the writers held a great place in the society. As Hamid's father, Himayatullah, himself was a great scholar of his time specially in Persian and Arabic, and used to teach these languages, so Hamid learnt his basic education from his father at home. We don't have any source to find whether he has learnt from other people also. After his education he opted the same profession of his father, as teacher. The historian Hasan writes about him as follows;

عمر عزیز خود ہمیشہ در تدریس گزرانید(6)

As Hamidullah spent the most part of his life in Shahabad so Shahabadi was associated with his name. During the past centuries the title Mulla or Molvi was given to the teachers of madrassas and the theologians and we find that Hamid was also given the title Mulla. So it can be said that he was a teacher and a theologian. He didn't cease to be the teacher only rather he learnt Jurisprudence and Hadith also. However it was because of his poetry not his teaching profession that Hamid achieved a ceaseless fame. His fame reached every part of Kashmir and extended to India and Afghanistan.

He wrote poetry and a few treatises in Persian language. Hasan states about him as;

طبع عالی داشت۔اشعار آبداری گفت۔(8)

Hamid spent the most of his time at his bith place, Shahabad, but the people of this village didn't treated him well and finally he moved to Islamabad in his old age. He was unhappy with the behavior of the people of Shahabad and has criticized them in his book Napursan Nama as follows:

بدتر ز دوصد دشمن یک یار شاہ آبادی — فتنہ است و دغابازی کردار شہ آبادی
از نقد ستمگاری وز جنس دغابازی — دیدیم ہر سو پاری بازار شہ آبادی
زن آبکش مردم دختر بکشد ہیزم — با اینہمہ، کج بینی دستار شہ آبادی
خوانی نعوذ باللہ ہر روز صد و یک بار — در عمر اگر ببینی دیدار شہ آبادی
ہم مال برد ہم جان ہم دین وہم ایمان — بدتر ز شیاطین دیندار شہ آبادی (10)

Hamid died in 1264 AH (equal to 1848), and According to Hasan he himself has told his date (year) of death.

تاریخ وفات خود گفتہ است:۔

عزیز از من گر کسی پرسدت — بگویش بخلد بریں شد حمید (11)

(بخلد بریں شد حمید۔۱۲۶۴)

Thus it can be said that Hamid has lived during the painful periods of Afghan and Sikh rule in Kashmir and finally died in 1848 at Islamabad Kashmir during the Dogra Period.

Works of Hamidullah Kashmiri:

Hamid was a man of high competence and talent and has played an essential role in the development of Persian language and literature in Kashmir which is unique in the history of Persian literature of Kashmir. Although his mother tongue was Kashmiri, he never went for this language for expressing his poetic talents but opted Persian for this art. After reading his works we find that on one side he had mastery over Persian language and on the hand he had a good hold on Arabic language also and has used so many Arabic words and sentences in his prose and poetry. The best example of his mastery over Arabic language and religious matters is his Radd-i Shia.

Hamidullah has compoded four books namely Akabrnama, Shakristan, Chaainama and Radd-i Shia in poetry and three books namely Dastur-ul Amal,

Napursaan Naama (or Bibujnama) and Gulzar-i Etibar in prose. It is pertinent to mention that none of his books except Akbarnama has got published. The manuscripts of all his books are available in the library of Department of Research and Publication Jammu and Kashmir, Srinager.

Hamid never praised of the kings and the rulers for his personal benefits. According to him Panegyric writing is a work of Satan because the panegyrist, for his personal benefits, eulogizes of the kings in such a manner that makes the kings arrogant and by this way he leads his patron astray. Moreover Hamid expresses that eulogizing the unworthy person has been prohibited by the Prophet.

ترک توصیف شہنشاہان کنم　　احتر از مدح گمراہان کنم
گفت پیغمبر ز مدح فاسقان　　آید اندر لرزہ عرش و آسمان
جیفہ خواری را چہ بستاید کسی　　از زر اندودن چہ حاصل برمسی
طامع گمرہ چہ چہ بستاید کسی　　کار با شیطان بانبازی کند (12)

But it doesn't mean that Hamid was unable in this fun. In his works we find that he has praised the Prophet of Islam, his companians and Abdul Quaidir Jilani, the founder of the Qadri order of the Sufism. Actually he never praised for the Greed of property. In Akbarnama he has praised of the Ghulam Mahiyuddin, the ruler of Kashmir, for during his time the situation in Kashmir was peaceful. To express about his talent he writes;

طبع من ہرگز نیامد این خلل　　تا کنم مداحی اہل دوّل
پیش مردم بہر زر سر خم کنم　　مدح و قدح ہجو و نعت وذم کنم
ورنہ من گر قصد این سودا کنم　　ہمسکان را بند بد رہ وا کنم
از سریر خامہ سازم گنگ و لال　　صد ہزاران طوطی شیرین مقال
طوطیان نوسخن خامش کنم　　جملہ از سحر سخن بیہش کنم (1 3)

In the above verses Hamid expresses that he has mastery over any form of the poetry but he didn't spoiled his talent for the greed of wealth otherwise he could mute the great poets of his time by his poetic talents in all forms.

Hamid has opted masnavi for his poetic expression and Akbarnama is the best example of his mastery over masnavi and epic writing. Akbarnama describes the outstanding works of the prince Akbar Khan son of Dost

Mohammad Khan the governor of Kabul and a detail of the wars of Afghan with Sikhs and British during the first half of nineteenth century specially the first Anglo-Afghan war (1839-1842), thus presenting prince Akbar Khan as hero of the story. It is a book of history in an epic form composed on the meter of Shahnama of Firdousi. Hamid has successfully followed Firdousi in Akbarnama and therefore Sabir Afaqi has introduced him as Firdousi of Kashmir.

Shakristan is the second longest masnavi of Hamidullah, including hamd, naat, munajat, manqabat and fifty six anecdotes in poetic form. In this masnavi, composed in ramal meter (بحر رمل). Hamid has mixed the story of love and beauty with philosophy and morality.

Chaninama is another masnavi by Hamid written in mutaqarib meter (بحر متقارب). Although Hamid has written so many verses in praise of Tea, specially kashmiri tea, yet for a detailed description of the properties of tea and comparing it with wine and tobacco he composed a separate poem (a masnavi) chainama in 257 verses.

Rad-i Shia is a masnavi of 590 verses written by Hamid to describe the Sunni differences with the Shia sect of Islam following Sheikh Abdul Aziz Dehlavi who also had composed the same theme in prose form.

Napursan Nama or Bebujnama is one of the best works of Hamid. It consists of prose and poetry, describing the oppression and coercion of the rulers and miseries of Kashmiri subjects during Sikh rule.

Dasturu-ul Amal is a prose work of Hamid consisting eight or nine short and informative anecdotes of exhortation in a rhythmic prose. In this treatise Hamid has addressed to his son, and indirectly to the young generation, and through the anecdotes he advised him the way to live a successful life. It also contains beautiful verses that add to the meaning anecdotes.

Gulzar-i Etibar is composed on the pattern of Gulistan of Saadi in which hamid provides anecdotes consist of moral and philosophical lessons and after each anecdote he brings few verses in poetic form.

Refrences:.

* For a detailed study of the life and works of Hamidullah Kashmiri see my M.Phil Dissertation Critical Analysis of Masnavi Akbarnama of Hamidullah Kashmiri submitted to Jawaharlal Nehru Universty, New Delhi (centre of Persian And Central Asian Studies) in 2014

Dr. Zubaida Jaan, Mulla Hamidullah Shahabadi, Hayat aur Karnameh, Department of Persian, University of Kashmir, Srinagar, 1995-6, p17.

The historian Pir Ghulam Hasan Khoyhami has writes "ملا حمید اللہ در برنگ می بود۔ آخر عمر در اسلام آباد رسید" (Hasan, tarikh-i Hasan, vol 4, p 56.) But Dr. Zubaida Jaan has also mentioned about the village Shahabad. (Dr. Zubaida Jaan, Mulla Hamidullah Shahabadi, Hayat aur Karnameh,, p17.

Pir Ghulam Hasan Khoyhami, Tarikh-i Hasan, Department of Research and Publication Jammu And Kashmir, Srinagar, 1960, vol 4, p 56.

G.L Tikku, Persian Poetry in Kashmir 1339-1976 An Introduction, University of California Press Barkeley, Los Angeles, London 1971.

Hamid Kashmiri,Akbarnama, Anjuman-i Tarikh, Kabul, 1330*, p 2.

Pir Ghulam Hasan Khoyhami, Tarikh-i Hasan, Department of Research and Publication Jammu And Kashmir, Srinagar, 1960, vol 4, p 56.

Dr. Zubaida Jaan, Mulla Hamidullah Shahabadi, Hayat aur Karnameh, Department of Persian, University of Kashmir, Srinagar, 1995-6, p 2.

Pir Ghulam Hasan Khoyhami, Tarikh-i Hasan, Department of Research and Publication Jammu And Kashmir, Srinagar, 1960, vol 4, p 56.

Islamabad is the common name of Ananrnag in Kasmir.

Mulla Hamidullah Shahabadi, Napursan Nama, , Library of Department of Research And Publication Jammu And Kashmir, Jammu, (Manuscript) Acc no.1916, p 4b

Pir Ghulam Hasan Khoyhami, Tarikh-i Hasan, Department of Research and Publication Jammu And Kashmir, Srinagar, 1960, vol 4, p 56.

The same verse has also been found by the auther on the last page of a manuscript of Akbarnama present in the Library of Department of Research and Publication Jammau And Kashmir, Jammu. (acc no 1916). The writer has mentioned that the Hamid composed this verse when he was moribund and on

'death's door' and it contains his death of death.

Mulla Hamidullah Shahabadi, Shakristan, Manuscript, Department of Research and Publication Jammu and Kashmir, Srinagar, No. 1916, p 14 b.

Mulla Hamidullah Shahabadi, Shakristan, Manuscript, Department of Research and Publication Jammu and Kashmir, Srinagar, No. 1916, p 14b-15a.

Sabir Afaqi, Firdousi-i Kashmir, Magazine Waheed - 1349 HS, no 86, p 405-6.

In the book " Hamidullah Shahabadi- Hayat aur Karname", published in 1995- 96, Dr. zubaida Jaan has mentioned about this book. After that in a book "Mullah Hamidullah Shahabadi- Kashmir Ka Ek Farsi Masnavi Nigaar" the author of the book has mentioned that Gulzar-i Etibar was available in the Library of Research and Publication Jammu and Kashmir, Srinagar. But the author of this article searched the book in the library during his research in M.Phil in 2013-14 but could not find it. Even this treatise has not found in the catalogue of manuscripts in Department of Research and Publication Jammu an Kashmir, Srinagar. It is possible the manuscript has been lost or has been saved wrongly under a different name in the said library. The author of Tadkira Akabir-i Kashmir (p 169) has also mentioned that this book was available in the Asiatic Society Bengal, but it has not been found in the catalogue of the Asiatic Society of Bengal.

Manuscripts: .

1. Hamidullah Kashmiri, Dastur-ul Amal, Liberary of Department of Research And Publication Jammu And Kashmir, Srinanr, Acc no979.

2. Hamidullah Shahabadi, Majmooa Beboojnama, AkbarNama,Shakristan, Chai Nama, Liberary of Department of Research And Publication Jammu And Kashmir, Srinanr, Acc no. 1916.

3. Hamidullah Kashmiri, Radd-i Shia, Liberary of Department of Research And Publication Jammu And Kashmir, Srinanr, Acc no. 2548.

Books:

1. Fauq, Mohammad Din, Mukammal Tarikh-i Kashmir, Tehqiq o Takhrij

Mohammad Babar Javed, Farid Book Depot (pvt) Ltd. New Delhi 2011.

2. Hamid, Hamid Kashmiri, Akbarrnama, ba Ehtimami-i Mohammad Shafi Rehguzar, Anjuman-i Tarikh , Kabul, 1330 HS.

3. Jaan, Dr Zubaida, Mulla Hamidullah Shahabadi- Hayat Aur Karnameh, Department of Persian, University Of Kashmir, Srinagar, 1995-1996.

4. Khoyhami, Pir Ghulam Hasan, Tarikh-i Hasan, , vol 2, Department of Research And Publication Jammu And Kasjmir, Srinagar, 1960.

5. Lone, Dr, Mohammad Yusuf, Mulla Hamidullah Shahabadi- Kashmir Ka Aik Farsi Masnavi Nigar, Department of Persian University Of Kashmir, Srinagar, 2002.

6. Sarvari Prof. Abdul Qadir, Kashmir Mein Farsi Adab Ki Tarikh, Sheikh Mohammad Usman And Sons, Srinagar, 2012.

7. Tikku, G.L, Persian Poetry in Kashmir 1339-1976 An Introduction, University of California Press Barkeley, Los Angeles, London 1971.

8, Sabir Afaqi, Firdousi-i Kashmir, Magazine Waheed - 1349 HS, no 86,

TARIKH-I-AZMI - 'A Book of History and Tazkira'

MUNISH KUMAR, Research Scholar
Department of Persian, A.M.U., Aligarh

Tarikh-i-Azmi is a history of Kashmir written by Khwaja Muhammad Azam Didamari in A.H 1160(1747 A.D.). Khwaja Muhammad Azam Kaul Didamari was a Sufi Kashmiri writer in the Persian language. Khwaja means 'master', Kaul is the surname meaning pundit, Didamari means from the Didamar quarter of Srinagar. Muhammad Azam Didamari, Khwaja belonged to Kashmir and was known for his Sufistic way of living. He was born in A.H. 1103. His father was an official in the government of Aurangzeb whom the emperor honoured with the title of 'Khair uz-zaman Khan.He passed away in A.H.1179(1765A.D.).His son Khwaja Muhammad Aslam,is the author of Gauhar-i-Alam and history of Kashmir in which he has made considerable addition to his father's work.

Khwaja Muhammad Azam was the author of many tracts demonstrating his range of mind. Khwaja Muhammad Azam besides being a saintly person was also a poet and is the author of several works. The tradition of history writing was continued by Khwaja Muhammad Didamari who flourished in Kashmir under the rule of the later Mughals. His history entitled Waqiat-i-Kashmir (The Story of Kashmir), also known after the writer's name as Tarikh-i-Azmi (History by Azam). It is a detailed historical survey covering the literary and cultural activities of Kashmir. It is a rich source of information about the life and achievements of the Sayyids, Sufis, Ulama and poets. It also reveals interesting information about the rulers, scholars, poets, prose writers and pious men. In Tarikh-i-Azmi there is a little bit information as far as the political conditions of Kashmir is concerned. Muhammad Azam Didamari is an eye witness of the later Mughal period and on social structure of Kashmir he had written about the 'begar' (forced labour) which was prevailed in the Kashmir valley at that time.Tarikh-i-Azmi or Waqiat-i-Kashmir is very beneficial for the students and scholars of Literature, History, Geography,

Sociology, Linguistics, Political Science, Geology, Archaeology and Genealogy.

Tarikh-i-Azmi almost covers the entire period of present work i.e. up to the 18th century. It provides information about the civilization and cultural influence of Iran, Afghanistan and Central Asia upon Kashmir.It also gives a very useful information about how Islam propagated and spread in Kashmir and what role Sufis, Ulama, Sultans and others had played in the promotion and establishment of education in Kashmir.In the initial, he deals with the history of Kashmir and throws light up on the geographical conditions and the flora and fauna of the state.

The author states that his main crux of writing this book is to mention the conditions of the Sufis right from the penetration of Islam in Kashmir upto his own period i.e., up to A.D. 1747.The chronicle written in Persian has the same way of history writing as it was in vogue in the history books of the Asian content that along with the political conditions,the Ulama, Mashaikh and the Sufis of the period also got their place and space.

Beginning:

''زینت صفحات دفتر ابداع وایجاد نزہت طبقات منظر عالم کون وفساد بنام مالک الملکی است الغ۔''

Muhammad Azam Didamari tells us in the preface that several Muslim writers, such as Mulla Husayn Qari, Haydar Malik and others, had translated the original history of Kashmir, entitled رازہ ترنگ, and brought it down to their own times; also that some Hindu had written an abridgement of it. As these works did not contain full particulars of the saints, ulama and poets of Kashmir, or deal with the events of more recent times, he determined to supply these deficiencies by the present composition.

The author commenced the work in A.H. 1148= A.D. 1735, which the title forms a chronogram, but he did not complete it till A.H. 1159=A.D. 1746, for which he gives the chronograms ترتیب ابواب الجنان and زیب وزینت کشمیر افزود

The book is divided into a Muqaddimah, three Qisms, and a Khatimah, as follows:-

Muqaddimah. Description of Kashmir.

مقدمہ در احوال وصفات کشمیر بطریق اجمال

Qism I. History of the origin of Kashmir and of the Hindu Rajahs who ruled there.

قسم اول در ابتدای بنایی این صوبہ وسلطنت بعض راجہا کہ درین شہر حکمرانی کردند۔

Qism II. History of the Muslim kings.

قسم دوم در احوال سلاطین اسلام درین شہر نزہت مقام۔الخ

Qism III. Kashmir under the Timurid kings.

بیان آغاز تصرف سلاطین سلسلہ علیہ تیموریہ در صوبہ کشمیر

Khatimah. Curiosities of Kashmir, and description of its Subahs.

خاتمہ در ترکاز بعض عجایب وغرایب کشمیر واحوال پرگنہ جات این خطہ دلپذیر

At the end, the author tells us that owing to a serious illness he could not proceed farther with the work, and concludes by enumerating the following works on which he based the present compilation: Tarikh-i-Sayyid'Ali; Tarikh-i-Rashidi, by Mirza Haydar; Muntakhab-ul-Tawarikh, by Ahsan Beg; Tarikh-i- Haydar Malik Chadwarah; Rishi Namah, by Bala Nasib; Darajat-us-Sadat, by Khwaja Ishaq; Asrar-ul-Abrar, by Baba Daud Mashkubi; Tuhfat-ul-Fuqara and other treatises by the author's spiritual guide, Muradi; Ma'asir-i-Alamgiri.

Number of the Hindu kings in Tarikh-i-Azmi

Tarikh-i-Azmi contains 90 kings of the Hindu period and describes their history with accuracy but still there are some such kings who suffer from the paucity of their information. Few of them are mentioned below:-

1) GONANDA I:- Gonanda I, the powerful ruler of Kashmir, being called upon for help his relative Jarasamdha, king of Magadha, beseiged Krishna, the divine hero of the epics, in his town of Mathura. After a prolonged contest the Kashmir king was slain by Krishna's brother Balabhadra.

2) SIDDHA:-Siddha, the son and successor of Nara, in obviously intentional contrast to his father and in conformity with his name (meaning 'saint'), is described as a very pious prince and credited with a bodily ascent to heaven.

3) JALAUKAS:- Of Pratapaditya's I, his son and successor Jalaukas, the author has otherwise nothing to tell us but they ruled justly and for exactly the

same period, thirty two years each.

4) SRESTHASENA:- Meghavahana's son and successor Sresthasena, who is said to have borne also the names of Pravarasena and Tunjina, we are told only that he built various sacred structures at Puranadhisthana, 'the old capital', the site of which is marked by the modern Pandrethan.

5) VIKRAMADITYA:- In his long reign of forty-one years nothing is related but the foundation of some sacred buildings no longer traceable.

6) PARVAGUPTA:- Parvagupta, who was descended from a humble family of clerks, did not enjoy long the possession of the crown which he had attained with so much treachery. After oppressing the land by his rapacity he died of dropsy within a years and a half of his accession (A.D. 949-950).

7) TARAPIDA:- Tarapida himself, after a cruel role of four years, is said to have succumbed to magic used by the Brahmans whom he had oppressed. The report as to the cause of his death and that of his elder brother may well be derived from contemporary tradition; for superstitious belief in the efficiency of magic rites, etc., forms an ancient feature of Kashmirian character.

A great part of the book is devoted to notices of eminent saints, poets etc. grouped under each reign. Tarikh-i-Azmi was published in Persian in A.D. 1747. Urdu translations were published by Munshi Ashraf Ali (Delhi, 1846), Khwaja Hamid Yazdani (Jammu, 1998) and Prof. (Dr.) Shamsuddin Ahmad (Srinagar, 2001). After the death of Khwaja Muhammad Azam Didamari his son Khwaja Muhammad Aslam added to the work with his Gauhar-i-Alam (Jewels of the world).

The manuscripts of Tarikh-i-Azmi are preserved in Raza library,Rampur, Khuda Baksh Library,Patna, Allama Iqbal Library,University of Kashmir, Maulana Azad Library,Aligarh Muslim University,Aligarh and many other parts of India. This history is one of the famous histories which have been written in Kashmir.

REFERENCES

1. Prithivi Nath Kaul Bamzai Culture and Political History of Kashmir: Ancient Kashmir 1994 - Page 38.
2. Mohammad Yasin, Madhvi Yasin Mysteries and glimpses of Kashmir 1996-Page 33.
3. K.K. Kusuman A Panorama of Indian Culture: Professor A. Sreedhara Menon 1990 - Page 318.
4. Didamari, Khwaja Muhammad (Azam), Waqiat-i-Kashmir (Persian mas. R and P) K.U. (Urdu tr. by Munshi Ashraf Ali), Delhi, 1846.
5. Didamari, Khwaja Muhammad 'Azam. 1998. Waqiat-i-Kashmir (tr. Khwaja Hamid Yazdani). Srinagar: Jammu.
6. Somnath Dhar Kalhana 1978 - Page 79.
7. Didamari, Khwaja Muhammad Azam, waqiat-i-Kashmir (Urdu tr.by Prof. (Dr.) Shamsudin Ahmad), Srinagar, April 2001.
8. History of Persian literature in Kashmir (in Urdu), by Prof. Abdul Qadir Sarvari - Page 189, 190, 191.
9. Stein, M.A (Eng. tr.) Kalhana's Rajatarangini: A chronicle of the kings of Kashmir, volume I - Delhi, 1979.
10. Dictionary of Indo - Persian literature by Nabi Hadi, 1995.

ROLE OF SYED ALI HAMEDANI TO PROPAGATE ISLAM AND PERSIAN LANGUAGE AND LITERATURE IN SUB-CONTINENT AND SPECIALY IN KASHMIR.

Mumtaz Ahmad
Research Scholar, Department of Persian, AMU, Aligarh

In the process of Islamisation of the Indian sub-continent the role of Persian Sufi's and Muslim saints is of great importance. These Sufis and saints were not just the preachers but they were scholars, professionals and giants of literary genius as well. Besides preaching they also contributed to the literature and culture of the people where ever they went.

In the undivided Indian sub-continent various Muslim conquerors came who were also great Persian scholars. Many of them did return to their native places after some time. Those who remained and ruled here cast a long lasting political, social, cultural and literary influence. TheSufis and Muslim saints who came here as the ambassadors of Islam left an inerasable influence on the life of people here. Their piety and piousness acted like a magnet for the people to come to Islam. They used Persian as a medium to propagate their message-the message of Islam. Those sufis who were the heralds of Islamic message in the sub-continent could not be listed without Amir KabirSyedAliHamedani R.A.(1)

Amir Kabir belonged to the Persian city of Hamdan where he was born in 1314 AD (714 AH). His father was Sheikh Shahabuddinand his mother's name was SyedaFatima. Shah Hamdan belongs to the lineage of Imam HussainRahmatullah. In the valley of Kashmir he is known as Shah Hamdanand Ali the second. (2)

He came to Kashmir in 1355 AD 774 AH for the first time in the reign of Sultan Shahabuddin Shah Mir. He is credited with thepropagation and promotion of Islamic message as well as the Persian language in Kashmir. Sultan Qutbuddin succeeded Shahabuddin. He was very fond of Persian literature.

GMD Sufi writes that " on the insistance of AmirKabirSultan Qutbuddin (1373-89 AD) built a college in his headquarter in Qutbuddinpur in srinagar and named it after himself. Peer Haji MohdQariwas the head of the institution which continued its existence till the establishment of Sikh rule in the valley. It had a long roll of well-known professors and scholars. Mullah Jauharnathwas the head of this institution during the reign of Jahangir. Mullah Muhsinfani the eminent philosopher poet and Mullah Abdul SattarMufti taught their pupils here. Mullah TahirGhaniAshaithe poet MohdZamanNafeAshaithe historian and younger brother of Ghani, and KhwajaQasimTirmiziare some of its distinguished alumni. This seminary became a great seat of learning besides promoting Persian language and culture.Qutbuddin thus laid the foundation of a residential system of education in Kashmir which provided for free association of teachers and pupils after formal hours of instruction, and thus paved the way for Sultan Zainulabidin in after years to establish his university of Nousheher near to modern Srinagar(3)

The first visit of Shah Hamdan to Kashmir spanned over four months. This period is the basis of Persianisation of Kashmir. In order to propagate Islam he established contacts with the sultan and other influential persons of the time. He initiated a regular 'dawah'work, from a raised platform on the bank of Jhelum which became thecenter of propagation of Islamic message. This place later on came to be known as Khanqah-E-Moallah. Shah Hamdanadvised those of his disciples who were ready to remain back in Kashmir to construct Khanqahsas the centers of Islamic preaching and Islamic seminaries to spread Islamic knowledge. This led to promotion of Islamic centers at Muzaffrabad, Poonch, Rajouri, Jammu andMirpur. The medium of Islamic propagation remained Persian. So the spreading of Islam in Kashmir region of Indian subcontinent was only through the Persian. Shah Hamdanhad ordered Shahabuddinto implement Islamic laws across his kingdom. On the request of Shahabuddin he wrote his famous treatise ZakheeratulMalooq. It is one of the most influential piecesof literature produced by this towering genius called Shah Hamdan.(4)

Besides being a Sufi of highest orderShah Hamdan was a scholar and

a poet at par excellence. He wrote profusely both in Persian and Arabic languages.He was a prolific writer. On his 2nd visit to Kashmir in 781 AH Shah Hamdan was accompanied by nearly 700 Saadats. This visit was a hallmark of Islamic propagation, promotion of Persian language, culture and literature of the finest order.(5)

Though in the period of Qutbuddin Kashmiris were by and large Muslims but they were unaware of Islamic laws. The king himself was married to two sisters at the same time. People also were ignorant and rituals, habits and culture was everything but Islamic. Shah Hamdan ordered the king to divorce one of the two sisters and advised him to dress likeMuslim rulers do. Nearly four thousand people pledged the oath of allegiance at the hand of Shah Hamdan at Khanqah E Moallahand became Muslim. The monotheism became the order of the day and Shah Hamdan continued his mission resulting in the conversion of 37000 people to Islam.(6)

In this regardrishinama has this to says.

اندراں دم ز زہرہ کفار شد پیدایت بسی و ہفت ہزار
ظلمت کافر شد بنور بدل سعادت رسید سعید ازل
ایں سعادت زداں را تنویر وابسطہ در میان امیر کبیر
یعنی آں بانی مسلمانی میر سید علی ہمدانی

The third and the last visit of Shah Hamdan to Kashmir in 785 AH was a result of political chaos in the central Asia and Iran due to the invasion of Timur. Shah Hamdan continued his mission unabated through propagationIslam and Islamic knowledge. His visit was more or less devoted to the propagation and the spreading ofIslamic laws, and the sharia and advice and advise to hold fast to Islamic laws and rules. This led to the spreading of Islamic light and brightness in the darkness of ignorance. Shah Hamdan visited Kashmir thrice and it seemed like coming and going of a beloved. Kashmiris requested and longed for Shah Hamdan to permanently settle in Kashmir. This is reflected in the folk lore of Kashmir as well.

شاہ ہمدان سون کیاہ نورانی چھم نے بوزان چھنے تہ روزانی

'Shah Hamdan has a towering personality but alas he is not ready for a permanent stay'. Sheikh YaqoobSarfiwas a towering poet of Kashmir. He has

written a masnawi(a genre of poetry in Persian of two couplets). Maslaq-ul-Akhyaar in the praise of Shah Hamdan R.A. he says e.g.

آں ہمدان مولد وختلان وطن شیوہ شیوہ او طے زمین وزمن

The devotion continued unabated. A quartet of a 13th century hijri Hindu poet is carved on the wall of Khanqah eMoallah. This speaks volumes of devotional love Shah Hamdan enjoys across a wide cross section society.

شہر کے قلب میں ہے مسجد شاہ ہمدان جس کے ہر دیدہ مسلم میں ہے نور ایمان
کہ درخشاں ہے ہر سمت کلاں یزداں خانۂ دل کو ضیاء بخش چراغ ایماں

Shah Hamdan left many legacies which are now a part of Kashmiri culture. Among these the most widely read literary treatise is the famous (auraad e fatiya) which resonates in the mosque of Kashmir after the dawn prayer. He had also brought a library of books from Khatlanwith him which isregarded as a priceless treasure. (7)

Dr. SirMohdIqbalwas highly influenced by the towering personality of Shah Hamdan. He has variously praised him in his work. e.g.

سید السادات سالار عجم دست او معمار تقدیر امم
تا غزالی درس اللہ ہو گرفت ذکر و فکر از دودمان او گرفت
سید آں کشور مینو نظیر میر و درویش و سلاطین را مشیر
آفرید آن مرد ایران صغیر با ہنر ہاے غریب و دل پذیر

Shah Hamdan is regarded as the founder ofIslam in Kashmirhe is known as Ali the second,Shah Hamdan, the embodiment of miracles etc. he was an emperor of a kingdom of hearts. His rule continues even after his death. He was a true Islamic Sufi whose glances turned the hearts and transformed the minds. He was a man of unparalleledwisdom; a genius of his own kind, his personality was a unique blend of the temporal and divine knowledge. He decorated the brow of sub-continent in general and Kashmir in particular with the forehead ornament of Persian. He is an extraordinary religious figure whose love and devotion still provides ecstasy to millions of Muslims in Kashmir. People still sung in his praise as a token of gratitude to his various contributions to Kashmir culturally, religiously and industrially. It is an unparallel contribution of Shah Hamdan that his visit to Kashmir proved to be the beginning of renaissance in Kashmir. He has left a lasting work of

Persianisation on Kashmir. So profound was the impact of Persian on Kashmir that Kashmir came to be known as little Iran.

References

1. Irfani A.H 1998 "shah hamdan and Kashmir" pg no 07.
2. Sufi G M D 1974 "kashir" vol. 1 pg no 85.
3. Sufi G M D 1974 "kashir" vol. 1 pg no 346.
4. Irfani A.H 1998 "shah hamdan and Kashmir" pg no 173.
5. Ruqaya S 2005 "begening and exaltion of Persian literature in Kashmir" pg no 106.
6. Ruqaya S 2005 "begening and exaltion of Persian literature in Kashmir" pg no 95.
7. Irfani A.H 1998 "shah hamdan and Kashmir" pg no 182.